

شکریہ

سکالانہ چندہ (معاذ اللہ)

قیمت فی کاپی

ہندوستان و پاکستان

ہندوستان (پاکستان)

آٹھ روپیہ ۲۵ پیسے

آٹھ روپیہ بارہ آنہ

۶۹ پیسے

۱۱/

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ ہی سے ہو سکتا ہے کہ یہی کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں مقبل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محمول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے ہسازوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، قدرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پندرہ روپیہ (علاوہ محمول)

من ویرداں

ہمند و مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عظیم فانی کا زمانہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخون عامہ کے ایک مشتے سے دہستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی، اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشا اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے حیت سات روپیہ آٹھ آنہ پیسہ (علاوہ محمول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے: (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان فوج (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قانون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یا جوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ سفید دبیر قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنہ۔

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

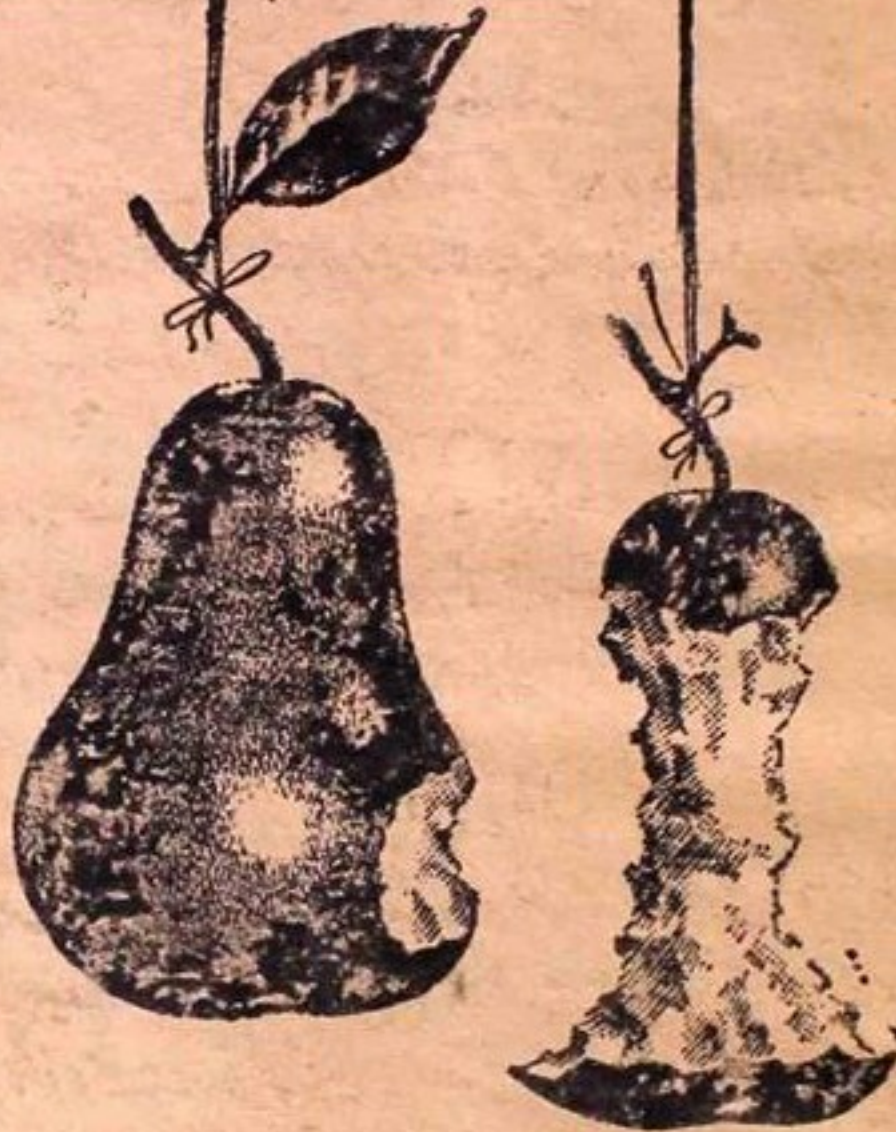
حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائیہ کا بہترین استخراج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی انشائیہ نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محمول)

ترغیبات حبشی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام نظری اور غیر نظری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بطل کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے، نیا اڈیشن۔ قیمت دس روپیہ عام

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے مدعی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) ماد میں کاغذ بنیادیت کسپا و مفید کتاب جو قیمت ۱۰ روپیہ (علاوہ محمول)



پہچانی صورتیں... اُن جانی سیرتیں

اُن کی مستقل خوبیوں کے باعث، اعتبار کرتے آ رہے ہیں۔ اور یہ اعتبار ہماری جانچ پرکھ کی بدولت ہے۔ ہندوستان لیور میں ہفتہ وار لگ بھگ ۴۰ بار مال کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ کچے مال سے فیکر مصنوعات کے تیار ہونے تک قدم قدم پر اُن کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ چیزیں باہر برداری میں یا پڑی پڑی خرابی ہوں۔ تجربہ گاہ میں مختلف درجوں کی آپ دھوا پیدا کر کے ان مصنوعات پر ان کے اثر کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے، اسی لیے ہماری مصنوعات مثلاً لائف بوائے صابن، ڈالڈاؤنا سیٹی، پڑاؤں، آکر، ٹوٹے میٹھ، میں وہ غولیاں پائی گئی ہیں جن کے باعث ان کا گھر گھر میں چرچا ہے۔ ان پر دودھ رنگ اعتبار کیا جاتا ہے کیونکہ انہیں کڑی جانچ پڑتال اور شکل سائنوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے ہارے ہاں اور اسکے برعکس ہاتھوں!

ناشپاتیوں کے اس جوڑے ہی کو لیجئے۔ بظاہر دیکھش زنگت کے باوجود، محض دیکھنے ہی سے آپ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ باقائے ہیں یا بد مزہ! اس لیے جب بھی ناشپاتیاں خریدیں، پہلے چکھ لیجئے! لیکن فرین کیجئے آپ کو صابن خریدنا ہے تو کیا کیجئے گا؟ اسے چکھنا تو بہر حال ممکن نہیں! خریداری جیسی چیزیں خریدتے وقت ایک بات دھیان میں رکھتے ہیں۔ یعنی چیزوں کا مقام اور چھاپ جنہیں استعمال کر کے وہ قابل اعتبار پا چکے ہیں۔

لگ بھگ ۷۰ برسوں سے لوگ ہندوستان لیور کی مصنوعات پر،



ہندوستان لیور کا آورش - گھڑ گھڑ کی خدمت

نئی کرنسی اور ڈاک کے نئے ٹکٹ کی وجہ سے

نگار کے سالانہ چندہ میں خفیف سا اضافہ

نئے سکوں اور ڈاک کے نئے ٹکٹوں کا جو اثر رسائل و جرائد پر پڑا ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس سے قبل پیسہ پیسہ والے ٹکٹ (جو دس تولہ وزن تک اخباروں اور رسالوں میں لگائے جاتے تھے) روپیہ میں ۲۴ ملے تھے، لیکن اس قیمت کے ٹکٹ اب روپیہ میں صرف ۵۰ ملیں گے اور اس طرح ہم کو سوا دو آنے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔

اس کمی کو پورا کرنے کا طریقہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس نقصان کو ہم آپ سب مل کر پورا کریں اور تمام حسابی الجھنوں سے گزرنے کے بعد اس کی صرف ایک ہی صورت سمجھ میں آئی ہے کہ ایک کاپی کی قیمت میں صرف ایک آنہ کا اضافہ کر دیا جائے یعنی بجائے ۱۰ کے ۱۱ کرنی کاپی اور سالانہ چندہ نئے کی جگہ پیسے، اس لئے وہی پی سالانہ آٹھ روپیہ ۸۴ پیسے میں روانہ ہوگا لیکن جو حضرات سالانہ ذریعہ رجسٹری حاصل کرنا چاہیں گے انھیں ۲۵ پیسے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔

چونکہ پاکستان کا سکہ نہیں بدلا ہے اور وہاں وہی پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا سالانہ چندہ پیسے ذیل کے پتے پر ہمارے نامیذہ پاکستان کو ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ براہ راست ہمارے پاس بھیج دیں (جس میں ۸ مصارف رجسٹری سالانہ بھی شامل ہیں) اور اگر پاکستانی ایجنٹوں سے ماہ ماہ کاپی خریدنا پسند کرتے ہیں تو ۱۱ کرنی کاپی ادا کریں۔

منی آرڈر کا پتہ :- ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی - نمبر نگار

نگار کے بعض سالناموں کی قیمت میں اضافہ

(چند دن کے بعد آپ کو کسی قیمت میں بھی نہیں مل سکتے)

مومن نمبر	ریاض نمبر	پاکستان یا جوہلی نمبر	افسانہ نمبر	مشرق وسطی نمبر	حسرت نمبر	دماغ نمبر
تین روپیہ	تین روپیہ	پانچ روپیہ	تین روپیہ	پانچ روپیہ	تین روپیہ	چھ روپیہ
فرمانیہ و ایمان اسلام نمبر	علوم اسلامی نمبر مع تتمہ	خدا نمبر	اصناف سخن نمبر	محصولہ ڈاک ذمہ خریدار	مجموعہ	مجموعہ
چار روپیہ	چار روپیہ	پانچ روپیہ	پانچ روپیہ	مجموعہ	مجموعہ	مجموعہ

سالنامہ ۱۹۵۸ء معلومات نمبر ہوگا

اس سالنامہ کی خصوصیات کا تفصیلی بیان مشکل ہے، کیونکہ یہ بڑا نامور مجموعہ ہوگا، ایسے سیکڑوں علمی، تاریخی، ادبی و تنقیدی مباحث کا جو اوٹ پر نگار کے قلم سے نکل چکے ہیں اور جو کبھی آپ کو کہیں نہیں مل سکتے۔
یہ مجموعہ ایک قسم کی انسائیکلو پیڈیا ہوگا جس سے آپ کو بہت سے اُن سوالات کا جواب ملے گا جو اکثر آپ کے ذہن میں آتے رہتے ہیں اور جن کے جاننے کا کوئی آسان ذریعہ آپ کے پاس نہیں ہے۔
نمبر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں

توزک جہانگیری (ڈٹاپ) کامل --- مٹہ	ہفت پیکر --- مولانا نظامی --- تے	آیات و جہدانی مرزا یگانہ --- مٹہ
تاریخ گلستان ہند --- مصور --- مٹہ	ہشت بہشت --- --- تے	مرقع خجائی دیوان غالب مصور --- مٹہ
درہ نادرہ --- محمد مہدی خاں --- مٹہ	شہنوی قرآن السعدین --- امیر خسرو --- مٹہ	باقیات خانی --- --- مٹہ
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی --- مٹہ	ہفت قلزم کامل قبول احمد --- مٹہ	آفتاب داغ --- نواب مرزا --- تے
تاریخ فرشتہ ۲ حصے --- محمد قاسم --- مٹہ	غیاث اللغات مع چراغ ہدایت --- مٹہ	گلزار داغ --- --- مٹہ
تذکرہ گلستان مسرت --- عبدالرحمن --- مٹہ	مصطلحات السعراء وارستہ --- --- مٹہ	انتخاب داغ --- --- تے
تذکرہ علمائے ہند --- رحمان علی --- تے	منتخب اللغات --- عبدالرشید --- مٹہ	دیوان ولی معہ دیباچہ حیدر ابراہیم --- تے
تذکرہ شوکت نادری --- --- تے	دریائے لطافت --- انشاء اللہ خاں --- مٹہ	تاج سخن --- جلیل مانگپوری --- مٹہ
دستان المذاہب --- مرزا محسن --- مٹہ	فرہنگ جہانگیری ۲ حصے کامل --- مٹہ	دیوان ذوق --- محمد حسین آزاد --- مٹہ
قصاید عرفی محشی --- جمال الدین --- تے	بہادر شاہ ظفر --- امیر احمد علوی --- مٹہ	مقدمہ شعرو شاعری و دیوان حالی --- مٹہ
دیوان فارابی --- --- تے	مشاہیر اسلام ۲ جلد --- --- مٹہ	مرآت الخیب --- امیر احمد مینائی --- مٹہ
دیوان ناصر علی سرہندی --- --- مٹہ	سیرۃ النعمان --- شبلی نعمانی --- مٹہ	دیوان قلیق --- ارشد علی خاں --- مٹہ
دیوان ہلالی --- --- مٹہ	حیات خسرو --- --- مٹہ	دیوان شہیدی --- کریمت علی --- مٹہ
حدیقہ حکیم سنائی --- --- مٹہ	سوانح مولانا روم --- --- مٹہ	صنمخانہ عشق --- امیر مینائی --- مٹہ
دیوان حافظ محشی --- --- مٹہ	حیات سعدی --- الطاف حسین --- مٹہ	دیوان امیر اللہ تسلیم --- --- مٹہ
کلیات غالب --- اسد اللہ خاں --- مٹہ	تذکرہ ہندو شعراء عبدالرؤف عشرت --- تے	دیوان مجروح --- میر مہدی --- مٹہ
خونابہ جگر --- غلام غوث خاں نیچر --- مٹہ	تذکرہ آب بقا --- --- مٹہ	غنیچہ آرزو میر و نیر علی صبا --- مٹہ
دیوان ظہوری --- نور الدین --- مٹہ	تذکرہ آب حیات --- محمد حسین آزاد --- مٹہ	منشوی میر حسن --- میر حسن --- مٹہ
دیوان صائب --- مرزا محمد علی --- تے	تذکرہ شمیم سخن تذکرہ شاعرات --- تے	منشوی گلزار نسیم --- دیان سنگر --- مٹہ
کلیات سعدی شیرازی --- --- مٹہ	تذکرۃ الخواتین --- --- تے	منشوی ترانہ شوق --- احمد علی --- مٹہ
کلیات جلال ابیر --- --- مٹہ	حور مقصورات --- افتخار عالم --- تے	منتخب انعامیں --- محبوب علی --- مٹہ
دیوان واعظ --- طاریف واعظ کاشفی --- مٹہ	گلکدہ --- محمد ہادی عزیزی --- تے	نغات کشوری --- --- مٹہ
دیوان کلیم --- ابوطالب کلیم --- مٹہ	دیوان ناسخ ۲ حصے --- امام بخش ناسخ --- مٹہ	عود ہندی --- اسد اللہ خاں --- تے
دیوان شوکت --- --- مٹہ	دیوان ذوق --- شیخ ابراہیم --- مٹہ	موازنہ انیس و دہیر --- شبلی --- مٹہ
دیوان فطرت --- --- مٹہ	مجموعہ قصاید ذوق مع ترجمہ --- --- مٹہ	رسائل شبلی --- --- مٹہ
دیوان میلی --- --- مٹہ	دیوان درد --- میر درد --- مٹہ	مکاتیب امیر مینائی --- حسن اللہ خاں --- مٹہ

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہنچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بینک ڈرافٹ پہنچے یہاں وصول ہو جائے۔ فیچر نگار لکھنؤ

یاد رکھئے کہ سالنامہ شعبہ اسی وقت محفوظ پہنچ سکتا ہے جب آپ ۸ کے ٹکٹ جرہری کیلئے بھیجیں

واہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چنڈہ اکتوبر میں ختم ہو گیا اور نومبر کا پرچہ دی، پنی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فختوری

جلد ۷۲	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۵۷ء	شمار ۴
۴	ملاحظات	۴۱
۶	حالی کے نکتہ چیں - رفیع الدین فیروز آبادی	۴۵
۱۰	عزیز لکھنوی غزل گو کی حیثیت سے - پروفیسر ابو محمد محمد فختوری	
۱۶	فلاسفہ کا تصور الہ - (نواب) محمد عباس طالب صفوی	
۲۵	کلام غالب کا طنزیہ پہلو - قرآن فختوری	
۳۲	ڈیڑار سیارے اور واہمنہ پرستی	
۳۶	۱۸۵۷ء اور اردو شعراء - گوپی چند نازنگ	
	محمود غزنوی کے خلاف بعض الزامات کی تردید	۴۱
	مشاعرہ نگار	۴۵
	منظومات :- فضا ابن فیضی - شفقت کاظمی	
	ریاض الرحمن شمس - نگہت بریلوی	
	ایس - ایچ ریگانی - عمر انصاری	
	کنول نسیم گنجابی - انیس امام آرد	
	مطبوعات موصولہ	۵۳

ملاحظات

بذنبیب پاکستان بذنبیبی، انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں قابل افسوس ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انفرادی بذنبیبی فرد کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور اجتماعی بذنبیبی سے پورا ملک متاثر ہوتا ہے اور اس کے اثرات بہت دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ شعبہ سے لیکر اس وقت تک پاکستان اندرونی سیاست کے جس بحران سے گزرا اور گزر رہا ہے، اس کی تاریخ اس میں شک نہیں بڑی تکلیف دہ ہے اور جس وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ابتدا ہی میں کوئی دستور بن جاتا اور وہاں کی عوامی قیادت و حکومت واقعی اچھے ہاتھوں میں ہوتی، تو اس وقت پاکستان خدا جانے کس منزل پر ہوتا۔ قیسماری یہ تکلیف اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اس صورت میں بھارت اور پاکستان دونوں دوش بدوش آگے بڑھتے اور اس وقت دنیا کی بین الاقوامی سیاست کا نقشہ اور ہی کچھ ہوتا۔

کچھ دن اس طرف کی بات ہے کہ کسی طرح وہاں کے دستور نے اچھا یا بُرا ایک ہیولی اختیار کر لیا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس کے پیش نظر ملک میں عام انتخاب کی کارروائی جلد ہو سکے گی جس کی سخت ضرورت ہے، لیکن حال ہی میں وہاں کی اسمبلی نے یہ تجویز پیش کر کے کہ پاکستان کو پھر متعدد دوسروں میں منقسم کر دیا جائے، اس امید کو بھی خاک میں ملا دیا۔

اس وقت تفصیل کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کا موقع نہیں کہ اس سے پہلے یہاں کے مختلف صوبوں کو تو ٹکڑیوں ایک صوبہ یا وحدت میں تبدیل کیا گیا، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اقتصادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے یہ اقدام بہت معقول تھا اس سے ایک طرف حکومت کے دفتری مصارف کم ہونے کی بھی امید تھی اور دوسری طرف صوبہ جاتی تفریق و تعصب کے دور ہو جانے کا بھی امکان تھا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کے مسلم لیگ لیڈروں نے ان دنوں باتوں کو اپنے لئے مفید نہیں پایا اور اب وہ پاکستان کو پھر اس کی سابق غیر آئینی منزل پر لوٹا دینا چاہتے ہیں۔

مغربی پاکستان صرف پچاس اضلاع اور دس ڈویژنوں پر مشتمل ہے اور اس کی کل آبادی ۴ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے اس لئے آبادی کے لحاظ

سے اس کو کئی صوبوں میں تقسیم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن پنجاب، سرحد اور سندھ کے باشندوں کے متضاد مطالبات و میلانات ایسے نہیں کہ وہ مل کر کام کر سکیں اور اسی لئے مغربی پاکستان کی وحدت کو توڑنے کی تجویز سامنے آئی ہے، لیکن اس کی تکمیل بہت دشوار معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس طرح دستور میں تبدیلی پیدا کرنا پڑے گی اور انتخابی کارروائی صوبہ دار کرنا پڑے گی جس کے لئے بڑا وقت درکار ہے، خدا کرے جنرل اسکندر مرزا مسٹر سہروردی اور ڈاکٹر خان صاحب اس مطالبہ کو مسترد کرنے میں کامیاب ہو سکیں اور پاکستان اس اندرونی تصادم کے خطرہ سے دوچار نہ ہو۔

مشرق وسطیٰ کی گتھی

اس وقت مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ الجھا ہوا مسئلہ شام کا ہے۔ ایک طرف وہاں امریکہ اپنا اقتدار قائم کرنے کا چاہتا ہے، دوسری طرف روس اپنا اثر ڈالنا چاہتا ہے، اگر امریکہ شام کو مرعوب کرنے کے لئے بحرِ روم میں اپنے بیڑے بھیجتا ہے تو دوسری طرف روس بھی سواحلِ شام تک اپنے بحری جہاز پہنچا دیتا ہے۔ اقتصادی اعانت کے لئے بھی دونوں طیار ہوں اور عسکری امداد کے لئے بھی، لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس دو عملی میں وہاں کی آئندہ سیاست کیا صورت اختیار کرے گی۔

اس وقت وہاں تین پارٹیاں ہیں جن میں عوام کا میلان زیادہ تر سوشلسٹ پارٹی کی طرف ہے اور اس پارٹی نے نہایت صفائی کے تقاضا ظاہر کر دیا ہے کہ وہ اشتراکی حکومت ضرور اپنے یہاں قائم کرنا چاہتی ہے لیکن وہ سوویت نمونہ سے بالکل علیحدہ خود ملک کے حالات و داعیات کے لحاظ سے متعین کی جائے گی۔ امریکہ کو یہ بات پسند نہیں وہ چاہتا ہے کہ شام بھی عراق کی طرح بغداد پکیٹ میں شامل ہو جائے اور وہاں بھی ایک ایسی ہی حکومت قائم ہو جائے جو اس کے اشارہ پر چلے۔

انسوس ہے کہ عرب ریاستیں آپس میں متحد نہیں ہیں اور وہاں کی سب سے بڑی سعودی حکومت بہت ڈانوا ڈول ذہنیت رکھتی ہے وہ امریکہ کی مخالفت کر سکتی ہے اور نہ وہ یہ چاہتی ہے کہ دوسری عرب ریاستوں سے کٹ کر علیحدہ ہو جائے۔ اس دوران میں اس کا رویہ شام کے متعلق بہت متزلزل رہا ہے۔ لیکن اگر اس کا حالیہ بیان صحیح ہے تو امید کی جاتی ہے کہ وہ شام کے جدید جمہوری رجحانات کی مخالفت نہ کرے گا اگر اس کی پڑوسی دولت کو اس سے کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

شام کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ پائپ لائن اسی کی سر زمین سے ہو کر گزرتی ہے جس پر پٹرول کی نقل و حمل کا انحصار ہے اور سعودی عرب کی ساری دولت اس کا پٹرول ہی ہے۔

بہر حال حالات موجودہ میں شام کے مسئلہ فی غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے اور اگر شام صحیح ڈپلومیسی سے کام لے تو اس وقت وہ روس اور امریکہ دونوں سے بگاڑ کے بغیر کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں روس اور امریکہ کے تعلقات جس حد تک کشیدہ ہو چکے ہیں اور روس، شام میں امریکہ کی ریشہ دوانیوں کو جس نگاہ سے دیکھ رہا ہے اس کا اندازہ وہاں کے وزیر خارجہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ امریکہ مغربی ایشیا (مشرق وسطیٰ) کو بارود خانہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور عرب ریاستوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر وہ دنیا کو بڑے خطرہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ اگر مشرق وسطیٰ کی بعض ریاستوں میں باہم جنگ بھی ہو گئی تو اسکی حیثیت محض مقامی ہوگی، لیکن اس کا یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ چنگاری ایک خاص جگہ بلند ہوئی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ ساری دنیا کو گھیر لیا۔ اس لئے اگر مشرق وسطیٰ سے جنگ کی چنگاری بلند ہوتی ہے تو سب سے پہلے روس اس آگ کو بڑھنے سے روکے گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کوشش میں اسے کم مزید جارحانہ اقدامات سے کام لینا پڑے۔ یہی وہ اندیشے تھے جن کی بنا پر روس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مغربی ایشیا میں طاقت استعمال نہ کی جائے اور ان ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیا جائے، لیکن امریکہ، فرانس اور برطانیہ نے روس کی اس تجویز کو مسترد کر دیا، جس سے ان کی نیت کا فوراً ظاہر ہے۔

روس اور بحرِ شمالی

بحرِ شمالی ایک ایسا سمندر ہے جو سال میں نو مہینے منجمد رہتا ہے اور صرف تین مہینے ایسے ہوتے ہیں جن میں وہاں جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ روس کے سامنے یہ بڑی دشواری تھی جسکو وہ دور کرنا چاہتا تھا اور دور نہ ہوتی تھی، لیکن اب اسے آٹمی قوت اس دشواری کو بھی دور کر دیا ہے اور اس نے ایک ایسا جہاز طیارہ کر دیا ہے جو بحرِ شمالی کی ۲۵ فٹ موٹی برف کی چادر کو پھاڑتا ہوا گزر جائے گا اور پیچھے آنے والے جہازوں کے لئے راستہ صاف کر دے گا۔ روس کی یہ کامیابی یورپ و امریکہ میں بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہے، کیونکہ اس طرح روس کی صنعت و تجارت اور عسکری نقل و حرکت بہت زیادہ وسیع ہو جائے گی۔

حالی کے نکتہ چیں

(رفیع الدین فیروز آباد)

”نقاد کی زندگی یہ نہیں ہے کہ اس کی رائیں درست ہوں اور ان کو مان لیا جائے بلکہ یہ ہے

کہ اس کی رائے کا ہمیشہ حوالہ دیا جائے اور اس سے اختلاف کیا جائے“

Santa Lewis (سینٹس بری) کے اس معیار پر اگر حالی کو تولد کیا جائے تو وہ اتنے باورزن نظر آتے ہیں کہ اردو ادب کی پوری تاریخ میں

ان کی نظیر نہیں ملتی ان کی شاعری اور مقدمہ شعر و شاعری کو جس قدر معرض بحث میں لایا گیا ان کے اٹھائے ہوئے مسائل کی جتنی چھان بین کی گئی ان کے نظریات پر جتنی لے دے ہوئی، ان کے مخلصانہ مشوروں پر جتنے شکوک کا اظہار کیا گیا اور ان کی تعریف و تنقیص میں جو کچھ کہا گیا ان میں سے اکثر قابل لحاظ نہیں ماہم معقولیت اور سنجیدگی سے جو کچھ لکھا گیا وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے نہایت بیش قیمت ادبی سرمایہ ہے۔

حالی شاعر تھے، مصلح تھے اور ایک نقاد بھی، ان کی یہ تینوں حیثیتیں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تاہم ان کے معاصرین کو ان کی جو باتیں شاق گزریں وہ ان کے تنقیدی نظریوں سے تعلق رکھتی ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب غالب کے خطوط عالم وجود میں آچکے تھے، مگر اس کے باوجود نئی نثر وجود میں نہیں آئی تھی اور اردو ادب کی بساط لے دے کہ صرف شاعری تک محدود تھی اور شاعری بھی غزل تک اور غزل بھی رعایت لفظی تک مبتذل اور رکیک مضامین کا بلا تکلف استعمال ہوتا تھا اور خیالات کو الفاظ کی بازیگری سے شاعری کا جامہ پہنا دیا جاتا تھا۔ حالی کا دل اس کیفیت سے بہت کڑھتا تھا۔ انہیں شاعری میں ان ڈھکوسلوں سے بڑی شرم آتی تھی اور اسی لئے انہوں نے مروجہ عشقیہ غزل کو بے سود اور دور از کار صنعت شاعری قرار دیدیا۔ گو انہوں نے یہ بات تسلیم کی کہ غزل اخلاقی مضامین کی متحمل نہیں ہو سکتی مگر غزل کی اصلاح کے لئے انہوں نے جو تجاویز پیش کیں وہ اس سے مختلف تھیں جو اس زمانہ کے شعراء کا دتیرہ تھیں اس لئے ان کا اور ان کے ہوا خواہوں کا برا فروختہ ہونا قدرتی بات تھی لکھنؤ میں اس کا رد عمل خاص طور سے ہوا کیونکہ وہاں کی شاعری میں وہ تمام خرابیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جن سے حالی بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ اخبار ”اودھ پنچ“ نے ان کے خیالات لعن طعن کا ایک طوفان برپا کر دیا اور حالی پر بڑے ناروا حملے کئے۔ حالی بڑے ضبط و تحمل سے یہ تاشہ دیکھتے رہے اور لوگوں کی گالیاں سنتے رہے لیکن

غل تو بہت یاروں نے مجھ پر گئے اکثر ان ہمیں

آہستہ آہستہ اس ہنگامہ کی شدت کم ہوتی گئی اور حالی کے تنقیدی نظریوں کی قدر و قیمت پہچانی جانے لگی اور جوں جوں عناد و تعصب کے بادل چھٹتے گئے حالی کو جینے کے لئے فضا ساز کار ہوتی گئی۔ مہدی افادی نے ان کی شاعری سے زیادہ ان کی تنقید کو اہمیت دی ان کی نظر میں حالی کی وقعت ان کے دیران کے اس سہ سے ہے جو انہوں نے مقدمہ کے نام سے لکھا ہے اور عصر حاضر کے نقاد بھی اس حالی کے قابل ہیں جس نے بقول سرور پہلے شاعری کی اور پھر مقدمہ لکھا۔ مگر اس زمانہ میں بھی حالی پر کچھ کم نکتہ چینیاں نہیں ہوئیں۔ البتہ یہ نکتہ چینیایں قابل اعتنا ضرور ہیں، کیونکہ ان میں سنجیدگی اور معقولیت سے حالی کے کارناموں کا سبازہ لیا گیا ہے اور ان کے خیالات اور ان کے نقطہ نظر کو ہمدردی سے پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کوششیں اکثر بے لاگ ہیں اور ان میں کسی طرح کی رعایت یا فروگزاشت نظر نہیں آتی بلکہ بعض جگہ یہ بے باکی حد سے تجاوز کر جاتی ہے کلیم الدین احمد جو نظیر تبر آبادی اور اپنے والد محترم کے سوا کسی برگزیدہ شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتے، حالی کے بارے میں اس حد تک نیچے اتر آتے ہیں کہ:-

” خیالات مانعہ۔ واقفیت محدود۔ نظر سطحی۔ فہم و ادراک معمولی۔ غور و فکر ناکافی۔ تیز ادنیٰ۔ دماغ و شخصیت اوسطیہ تھی

حالی کی کل کامنٹات ”

مگر اس کے باوجود انھیں بھی اعتراف ہے کہ :-

” عصر حاضر میں جب انشا پر دازوں کا مطلع نظر حالی کی طرح محدود نہیں، جب کہ وہ بہترین مغربی کارناموں سے واقفیت

رکھتے ہیں اس کے باوجود کسی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا۔“

اور یہ کہ :- ” حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں، اس وقت اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔“

در اصل حالی کو ان کے زمانہ اور ان کے ماحول کے بجائے آج کے معیار پر پرکھنا ان کے ساتھ بڑی زیادتی اور نا انصافی کی بات ہے۔ انھوں نے اپنے زمانہ میں جو کچھ کہا اور جو کچھ کر دکھایا اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔

نئی انگریزی دال نسل کو حالی میں ایک بہت بڑی کمی یہ نظر آتی ہے کہ وہ انگریزی زبان سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جن لوگوں کے ذریعہ انھیں انگریزی ادب سے واقفیت حاصل ہوئی تھی وہ خود بھی عالمانہ بصیرت سے محروم تھے، یہ بات ایک حد تک درست ہے مگر اس سے تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ انھیں انگریزی سے استفادہ کے پورے وسائل جہاں نہیں تھے تو بھی انھوں نے انگریزی سے وہ کچھ اخذ کیا کہ جس سے اردو میں صحت ادب کی بنیادیں قائم ہوئیں اور جن پر ایک عالی شان محل کی تعمیر کے امکانات پیدا ہو گئے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی سے ناواقفیت کے باوجود انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری جیسی کتاب تصنیف کی جسے اردو میں پہلی تنقیدی کتاب کا درجہ دیا گیا اور جس کے مباحث اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے آج بھی حزن آخر کی حیثیت رکھتے ہیں تو ہمیں ان کی غیر معمولی ذہانت اور عالمانہ بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ رہی یہ بات کہ انگریزی سے ناواقفیت کے باعث ان سے بہت سی لغزشیں اور فروگزاشتیں ہوئیں سو اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ مولانا کی لغزشیں ثابت نہیں کرتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان دلائل کی وجہ سے ان کی عظمت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے بہترین شاعری کی تین صفات بتائی ہیں، سادگی، اصلیت اور جوش جو لٹن کے الفاظ، Simplicity - Sincerity اور Passion کا ترجمہ ہیں اور وہ بھی غلط ترجمہ۔ کیونکہ Sincerity کا ترجمہ اصلیت نہیں بلکہ اصلیت پر مبنی رنگینی ہے اور یہ کہ لٹن کی نظریں ان الفاظ کی کوئی خاص وقعت نہیں تھی جبکہ حالی نے انھیں بے انتہا اہمیت دیدی۔

حالی کی نظر میں ان کی کچھ بھی اہمیت ہو مگر ان معترضین کی نظریں تھوڑی سی وسعت ضرور ہونی چاہئے تھی۔ انھیں یہ جاننا چاہئے تھا کہ سالی نقال نہیں تھے بلکہ وہ نقاد تھے ان کا اپنا وسیع تجربہ تھا، گہری نظر تھی اور اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھتے تھے اور اگر ان کے خیالات مغربی مفکرین کے خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مغربی ادب کا چربہ ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی کے مطالعہ سے ان کے شعور اور ذہن میں جلا پیدا ہوئی اور انھیں نئی راہیں اور نئے امکانات نظر آئے اور ان کے دل میں اردو شاعری کی اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی مگر یہ اصلاح اردو کے مزاج اور ان کے اپنے مشاہدہ کے مطابق تھی، کسی کی نقل نہیں تھی۔ اور تو اور مولانا کی اخلاقیات کو بھی انگریزی اخلاقیات کی حریں اور نقل سمجھا گیا۔ اور جب انھوں نے اردو دشمنوں کے فحش اور عریاں مقامات پر انگشت نہائی کی تو اسے انگریزی سے ناواقفیت کی دہلیز سمجھا گیا اور کہا گیا کہ انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریزی میں اس سے بھی زیادہ عریانی خود ان شعراء کے یہاں موجود ہے جن سے حالی متاثر ہیں اور مثالیں شریک پتیر اور لٹن کے کلام کے عریاں مقامات پیش کئے گئے، لطف یہ ہے کہ یہی نقاد حالی پر ان کی مذہبی شیفتگی کا الزام عاید کرتے ہیں اور انھیں خشک اخلاق مبلغ بتاتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ حالی نے مذہب کے ماحول میں پرورش پائی تھی اور خالص اسلامی طرز کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھیں اپنے زمانہ کے مشہور اور جید علماء سے اکتساب فیض کا موقع ملا تھا لہذا ان کے مزاج میں اسلامی اخلاق پوری طرح رچ بس گیا تھا۔ اس کے علاوہ

وہ ادب میں افادیت کے قابل تھے اور علی گڑھ تحریک سے متعلق ہونے کی وجہ سے خود بھی ادب کو اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ پھر اگر انگریزی ادب میں انھیں کہیں اخلاق کی جھلک نظر آئی تو ان کی توجہ اس طرف مبذول ہونا قدرتی بات تھی مگر حالی جس اخلاق کے قابل تھے اس میں عربی، فحاشی اور لذت گناہ تھی چاہے وہ ٹیکسیر کے یہاں ہو یا ملٹن کے یہاں۔ وہ اسے کسی حالت میں قبول نہیں کر سکتے تھے ان کا واسطہ اردو ادب سے تھا اس لئے اس میں جہاں یہ خرابی نظر آئی انھوں نے اس کی مذمت کی۔ اگر انھیں انگریزی ادب پر عبور حاصل ہوتا اور انھیں اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا موقع ملتا تو یقیناً وہ ٹیکسیر اور ملٹن کو بھی معاف نہ کرتے۔

حالی نے مرثیہ میں اخلاقی نظموں کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ان نظموں سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکا کیونکہ مرثیہ رونے رولانے کے لئے لکھے جاتے تھے اس لئے سامعین کو نفس مضمون کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ بات کتنی سیدھی اور صاف ہے مگر اسے ایک غلط رجحان کا سبب قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا ہوئی کہ کسی پہلے سے طے کی ہوئی رائے کے مطابق ادب سے اثر لیا جاسکتا ہے اور پرزور الفاظ کے ذریعہ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہذا تنقید نگاری اور اشتہار بازی میں کوئی فرق نہیں رہا اور تنقید اچھانے کا فن ہو گئی۔

خوب غور کرنے پر بھی ”بوڑھے حالی“ اس الزام کی زد میں نہیں آتے یہ امر واقعہ ہے کہ مرثیوں میں اعلیٰ درجہ کے اخلاقی ادب پائے جاتے ہیں اور اثر پذیر ادب کا خاصہ ہے اس لئے ہر پھسلا آدمی یہ توقع قائم کرنے میں حق بجانب ہے کہ ان ادب پاروں سے اخلاقی نتائج مرتب ہونے چاہئیں، پھر جب غایتی میلان ادب کی جان سمجھا جاتا ہے اور حالی افادی ادب کے پیغمبر ہیں تو ان کی یہ آرزو کہ ادب میں خاطر خواہ اثر ہونا چاہئے بالکل قدرتی ہے، یہاں خاطر خواہ کا مطلب من مانا نہیں ہے کہ اپنے زور قلم سے غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط قرار دیا جائے بلکہ یہ کہ میرا اثر ہونا چاہئے ویسا ہی ہے، حالی تنقید میں دیانتداری کے بڑے مبلغ ہیں اور خود ان کی تنقیدیں اس کی بہترین مثالیں ہیں اس لئے یہ نامناسب ہے کہ اسے بددیانتی سے منسوب کیا جائے، البتہ حالی کی دیانتدارانہ روش کا منفی طور پر اثر قبول کرنے والے ضرور غلط رجحان اختیار کر سکتے ہیں۔

نئے نقادوں کی نظر میں حالی کا ایک سنگین جرم یہ بھی ہے کہ وہ نئی قدروں کو تسلیم کرنے کے باوجود پرانی قدروں کے بھی قائل ہیں۔ انھیں یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ وہ خالص انتہا پسند کیوں نہیں ہیں، چنانچہ ان کی تنقیدی قدریں۔ قبول عام حاصل ہو جائے۔ معیاری زبان ہو۔ نیچر ہو۔ کم و بیش پرانی قدریں ہیں اس لئے قابل اعتنا نہیں ہیں۔ جھوٹ نہ ہو۔ دلگدازی ہو۔ سادگی ہو۔ یہ بھی قییم تنقیدی نظر کے ہیں اس لئے خارج از بحث ہیں۔ گویا پرانی قدریں اور قدیم تنقیدی نظریے کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور نئی تنقیدیں ان کی گنجائش نہیں ہے حالانکہ ان قدیم نظریوں میں سے کسی ایک کو بھی پوری طرح رد نہیں کیا جاسکتا۔ قبول عام کی سند آج بھی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ میران جی کے کلام کی تعریف و توصیف میں مثل قصیدے لکھے گئے مگر انھیں قبول عام حاصل نہ ہونے کے باعث زندگی نصیب نہیں ہوئی اور ان کی شاعری اردو ادب میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکی۔ بر خلاف اس کے نظیر اکبر آبادی کو ان کے معاصرین نے قابل اعتنا سمجھا اور ان کی شاعری سوقیانہ اور گھٹیا درجہ کی قرار دی گئی مگر انھیں قبول عام حاصل تھا اس لئے آج تک زندہ و تابندہ ہیں۔ اسی طرح معیاری زبان۔ سادی دلگدازی اور نیچرل شاعری کے بارے میں حالی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے انحراف نہایت مشکل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں ترنم کا فقدان ہے اور وہ واردات قلبی سے بالکل مانوس نہیں ہیں اس کا صحیح فیصلہ تو کوئی صاحب دل ہی کر سکتا ہے مگر بظاہر ان کا دل درد سے لبریز نظر آتا ہے۔ یہ درد مندی انھیں بچپن ہی میں نصیب ہو گئی تھی جبکہ والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ ان کی ساری زندگی اس کی گواہ ہے کہ وہ ذرا سے احساس سے خصوصاً کسی کی تکلیف دیکھ کر ٹپ جاتے تھے اور اگر واردات قلبی کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے تو بھی حالی ہی مایہ نظر نہیں آئیں گے اگر یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری کی اساس جھوٹ برہمنی نہیں تھی تو انھیں خود اعتراف ہے کہ عشق نے ”ان کے بھی دل پر آخر چیر کا لگا کے چھوڑا“ پھر ان کی شاعری میں خوشگلی اور دل پریشانی ملتی ہے وہ مزید کسی

ثبوت کی محتاج نہیں ہے :

بیتقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
اک عمر چاہئے کہ گوارا ہونیش عشق
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
اب وہ اگلا سا التفات نہیں
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
اس کے علاوہ ان کی نظمیں - مرثیے اور مستزاد کے بہت سے ہند ایسے جگر خراش ہیں جنہیں پڑھ کر خود بخود دل امنڈنے لگتا ہے اور مستزاد تو عام مجموعوں میں ایک مخصوص ترنم کے ساتھ مدتوں پڑھا گیا جسے سن کر لوگوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی ان کی مشہور منظوم دعا :-
اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
آمنت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
ورد اور اثر میں ڈوبی ہوئی ایک فریاد ہے جو دل سے نکلتی ہے اور دل سے جا بھرتی ہے - دلی کی تباہی پر ان کا مشہور قطعہ :-
تذکرہ دلی مرحوم کا اسے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
اور غالب - خواجہ امداد حسین اور حکیم محمود الحسن کی وفات پر ان کے مرثیے اس بات کے شاہد ہیں کہ حالی کتنا اثر پذیر دل رکھتے تھے -
حالی کا خیال تھا کہ شاعری جمہوری دور میں فروغ پاتی ہے - مگر ان کے اس خیال کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ "انھوں نے جمہوری سلطنتوں میں سیاسی بتوں کے پرستار شعراء دیکھے نہیں نہ انھیں خبر ہے کہ جمہور نہایت پست اور سست فکری خیز ادب پسند کرتے ہیں" - یہ خیال سطحی غور و فکر کا نتیجہ ہے اور ایسے نقادوں کو زیر یہ نہیں دیتا جو ادب کو اس کے زمانہ اور احوال کی روشنی میں پرکھنے کے مدعی ہیں -
حالی شاعری میں خیالات اور مضامین کے اعتبار سے وسعت دینے کے پروردگار تھے - جبکہ اب تک شاعری میں داخلی کیفیات کا عنصر غالب تھا - حالی کے داغ میں یہ نکتہ روشن تھا کہ ہمارے شاعر من کی دنیا میں کیوں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں - انھیں زمانہ کی افراط فری اور کس بڑی کا احساس تھا، اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا - سیاسی نظام مفلوج ہو کر رہ گیا تھا لوگوں کو اطمینان و سکون نصیب نہ تھا - یادم در آتا ہوا شاہی دربار تھا جس کی نام نہاد آن بان پر قصیدے تصنیف ہوتے تھے یا خانقاہی تقدس تھا جہاں دنیا کے شر خوشوں سے تنگ آکر مسایل تصوف پر طبع آزمائی ہوتی تھی یا پھر خیالی محبوب تھا جس کے عشق کی گرمی اندر جذبات کی شدت غزل گسار کی موجب ہوتی تھی - شاعری کے یہ میدان کثرت استعمال سے تنگ سے تنگ تر ہوتے گئے اور ادنیٰ تغیر کے ساتھ یکساں خیالات کی مسلسل تکرار ہوتی رہی، حالی نے ناکارہ شخصی حکومتوں کو اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرایا اور یہ رائے قائم کی کہ شاعری جمہوری دور میں فروغ پاتی ہے - پھر اگر ان کی یہ رائے تجربہ کی کسوٹی پر غلط ثابت ہوتی ہے تو ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے بھی یا "جو چاہیں سو آپ کریں میں ہمیں عجب بدنام کیا" والا معاملہ ہے -

بعض نادر کتابیں

(صرف ایک ایک نسخہ موجود ہے)

نظام الملک طوسی - مصنفہ عبدالرزاق کاشمیری قیمت علاوہ محصول ۷۵ روپے
الہرامکہ -
دیوان رند -
یہ تمام کتابیں اگر ایک ساتھ لی جائیں گی تو محصول ۷۵ روپے میں مل سکیں گی - جو کتابی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے -
میزبان
میں ہر نگار لکھنؤ

عزیز لکھنوی غزل گو کی حیثیت سے

(پروفیسر ابو محمد نحر۔ فچوری)

دور بعد میں غزل کا نشاۃ ثانیہ کچھ تو اس انحطاط کا رد عمل تھا جو غزل میں آتش و آسج کے شاگردوں سے شروع ہو کر امیر و داغ کے زمانہ میں اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا اور کچھ جدید اردو شاعری کی تحریک کا اثر تھا، غزل کو ابتداء، تصنع اور رعایت لفظی کے گڑھے سے نکالنے کی کوشش رہی۔ پہلے لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کی صالح روایات کو یکجا کرنے اور خیال و بیان میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یوں تو بطور عام شعراد کے کلام میں بھی کچھ اشعار ملتے ہیں جو اس روش کے آئینہ دار ہیں لیکن اس کا سب سے کامیاب نمونہ حسرت کا غزل ہے۔ یہ حسرت ہی کا غزل تھا جس نے نارسیت اور داخلیت کے جھگڑے کو ختم کر کے یا اس کی اہمیت کو کم کر کے غزل میں دوسرے رجحانات کے پروان چڑھنے کے لئے زمین ہموار کی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں غزل اصلاح وقت کا اتنا بڑا اور اہم تقاضا تھی کہ خود لکھنوی شعراء بھی اس کو نظر انداز نہ کر سکے بلکہ سب سے پہلے اس کی طرف جلال ہی نے توجہ کی جو اپنے زمانہ میں دبستان لکھنؤ کے ایک ممتاز شاعر تھے، جلال کے کلام کا وہ حصہ جس میں جذباتی صداقت، معنویت اور سادگی کی کار فرمائی ہے اور جو بظاہر تیسری تقلید میں ہے اس کا بین ثبوت ہے۔ لیکن جلال بہر حال واحد علی شاد کے زمانہ کے لکھنؤ کی ہوا کھائے ہوئے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسی معاشرتی اور ادبی فضا کے پروردہ تھے جس میں تعیش پسندی، سوقیانہ پن، تصنع اور سطحیت کی بے بہت تیز ہو گئی تھی۔ الحاق اودھ کے بعد جب امیر کی طرح انھیں نصیر باغ کے میلے یاد آتے ہوں گے تو بلاشبہ ان کا غنچہ دل بھی سوکھ جاتا ہوگا۔ لہذا جلال نے غزل کو نئی زندگی کی جو ہلکی سی جھپٹک دکھائی وہ ان کے لئے بہت تھی اور ہمیں بھی اسے بہت سمجھنا چاہئے۔ غزل کی اصلاح کے لئے سرزمین لکھنؤ ایسے شعراء کی منتظر تھی جن کے دل و دماغ کی نشوونما تعیش پسندی اور سوقیانہ پن کی لے کے کافی مدھم ہونے کے بعد ہوئی ہو اور جو صحت منداثرات کو قبول کرنے کے لئے اپنی ذہنیت اور اپنے اعمال دونوں کے لحاظ سے طیار ہوں۔ چنانچہ جلال کے بعد جن لکھنوی شعراء نے غزل کو راہ راست پر لانے کی سعی بلیغ کی ان میں صفی، محشر، عزیز اور شائق خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور ان میں عزیز ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔

عزیز ایک پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ قصیدے بھی کافی تعداد میں یادگار مچھوڑے ہیں۔ انھوں نے قصیدے میں جو بے طرازی کی ہیں ان کی بڑا پر اس صنعت میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے، لیکن اس مضمون میں ہمیں صرف ان کی غزل گوئی سے سروکار ہے اور یہاں اس پر اکتفا کی جاتی ہے۔ عزیز کی غزل گوئی کا ٹھکانہ مجموعی حیثیت سے روایتی ہے۔ ان کے یہاں حسرت کی طرح حسن و عشق کے تصورات میں کوئی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی۔ مضمون بھی زیادہ تر روایتی ہیں۔ وہی معاطات حسن و عشق، دار و درات قلبی، ناصح، رقیب اور چارہ گرد وغیرہ کا ذکر ہر غزل گو شاعر کو ورثہ میں ملتا ہے، عزیز کے حصہ میں بھی آیا ہے۔ لیکن اس محدود دائرے میں عزیز نے دبستان لکھنؤ کی عام خصوصیات سے گریز کر کے حقیقی جذبات لگائے، معنویت، متانت اور سنجیدگی کے ہر جزاء داخل کئے ہیں وہ غزل میں عام طور پر اور لکھنوی غزل میں خاص طور پر ایک نئے موڑ کا پتہ دیتے ہیں۔ عزیز کی غزلیں فرسودہ اور سوقیانہ مضامین، ابتداء، تصنع اور رعایت لفظی سے عام طور پر پاک ہیں۔ ان کی غزلیں ان کے پیش روؤں کے برخلاف ہموار ہیں اور ان کے کلام کی عام سطح بھی مقابلتا زیادہ بلند ہے، زبان و محاورہ کی سمت اور خوش اسلوبی کا عزیز خیال

امیر افسردہ ہو کر غنچہ دل سوکھ جاتا ہے

وہ میلے ہم کو نصیر باغ کے جب یاد آتے ہیں

۱۱

رکھتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کا میلان معنویت کی طرف زیادہ ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں ندرت ادا کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی اکثر بخیر اپنا رنگ دکھاتی ہے لیکن اس طرح کہ حقائق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ ناصح پر لعنت و ملامت غزل کا ایک عام مضمون ہے لیکن عزیز کہتے ہیں

ناصر کی قدر آج سے کچھ ہوگئی عزیز
وہ دردے کے آسے ہیں دل میں کہیں سے ہم

رشتک کے مضامین میں غزل کو شعرانے طرح طرح کی معنی آفرینیوں سے کام لیا ہے۔ غالب نے خصوصیت کے ساتھ اس میں زور طبیعت دکھایا ہے۔ معشوق سے رقیب کی قربت یا ہمکلامی پر رشتک تو خیر ایک معمولی بات ہے، انھیں کہیں اپنے آپ پر رشتک آتا ہے کہیں اپنی طاقت و دیوار پر، یہاں تک کہ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ عزیز نے بھی اس مضمون کو نئے نئے پہلوؤں سے نظم کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

رشتک سے روح یہ بیدار کیا کرتے ہیں روک کر سانس انھیں یاد کیا کرتے ہیں
ہلاک رشتک ہوں میں دل کی غمخواری سے باز آیا تمہارا راز داں جو ہے وہ میرا راز داں کیوں ہو
یارب ایسے رشتک کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہیں خود نہیں منظور اس کے گھر کی درباری مجھے

رنج و غم، یاس و حرم اور محرومی و ناکامی کے مضامین کی عزیز کی غزلوں میں کثرت ہے۔ جذبہ کی صداقت اور احساس کی شدت کی وجہ سے بعض اشعار درد و اثر کا مرقع بن گئے ہیں۔ جذبات کے بیان میں عزیز کی نظر نفسیات انسانی پر بہت گہری پڑتی ہے۔ جذبے کی صداقت، شدت، حساس اور نفسیاتی حقیقت نگاری کا جو امتزاج ذیل کے شعروں میں موجود ہے وہ ہر غزل گو شاعر کی بڑائی کو منوانے کے لئے کافی ہے۔ غالباً انھیں اشعار کے پیش نظر ”گلکدہ“ کے متعلق اقبال کو کہنا پڑا تھا کہ ”موجودہ ادبیات اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعہ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے۔“

مردیں گزریں کہ دل میں کوئی بات آتی نہیں میں ہوں اور دن رات دہرانا تری تقریر کا
دیکھ کر ہر درو دیوار کو حیراں ہونا وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا
دل بھی تھا اور دل میں دنیا بھر کے سامان نشاط تم سمجھتے تھے میں سو زغم سے تنہا جل گیا
آگ تو دل کی بجھا لینے دو پھر کچھ پوچھنا ہوش کس کو جو بتائے کیا رہا کیا جل گیا
میں اور اپنی زلیبت سے مایوس ہو گیا جب رو دیا مجھے کوئی غمخوار دیکھ کر
دل کبھی تھا ہمارے پہلو میں یہ خدا جانے بات ہے کب کی
طول شب فراق کی کچھ انتہا نہ پوچھ اتنا ہے کہ زلیبت سے بیزار ہو گئے
دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

ان میں سے ہر شعر اپنی جگہ پر اہمیت کا مالک ہے۔ اہمیت کا جو راز ہے اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ہر شعر کی الگ الگ تشریح طوالت سے خالی نہ ہوگی۔ چوتھے اور آخری شعر میں نفسیات عشق یا ان کے لیے کہ نفسیات انسانی کے دو باریک پہلوؤں کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اگر ان کا شمار ان شعروں میں کیا جائے جنھیں اردو غزل کا حاصل کہنا چاہئے تو بیجا نہ ہوگا۔

جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے عزیز کے کلام میں رنج و غم کے مضامین کی بہتات ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں فانی کی طرح قوی کہنا صحیح نہ ہوگا، اگرچہ بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے۔ عزیز کی غزلوں میں آہ و بکا اور الحاح و زاری کا غلبہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کی دلکشی اور رنگینی سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

وقت کم آ رہا شمس مستی بہت سخت حیرت ہے کہ کیا کیا دیکھتے

انھیں فانی کی طرح زندگی کی دوازی کا رونا نہیں ہے بلکہ اس کی کم فرصتی کی شکایت ہے۔ انھیں صوفی ہستی سے لگاؤ نہیں ہے بلکہ ادبیت ہستی سے لگاؤ ہے اور یہی وہ تعلق ہے جو انھیں اس زندگی پر بھی مرنے پر مجبور کرتا ہے جو چین سے بسر نہ ہوئی۔

ہم اس زندگی پہ مرتے ہیں جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خوشی کے لمحوں کو بھی اپنی یادوں میں محفوظ رکھا ہے :-

یاد ہے ساتی پرستوں کو وہ منظر آج تک چاندنی تھی بادۂ گلرنگ تھا پیمانہ تھا

تم تھے اور ہم تھے دور سا غرختا ہائے وہ وقت بھولتا ہی نہیں

عزیز کے کلام میں رنج و غم کے مضامین کی کثرت جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے ان کی طبیعت کی افتاد ہے لیکن افتاد طبیعت نے نظریاتی شکل نہیں اختیار کی ہے۔ فانی افتاد طبیعت کے شکار تو ہیں ہی لیکن جو چیز ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی وہ ان کا نظریہ ہے۔ عزیز کی شاعری میں نظریے کا کوئی خاص دخل نہیں ہے اور اگر ہے تو بالآخر اس کی تان قنوطیت اور بے علی کے بجائے رجائیت اور عمل پر ٹوٹتی ہے۔ رجائیت کا پہلو ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ عمل کا پہلو ملاحظہ ہو :-

فرصتِ زینت کم ہے کام بہت کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

عزیز کے کلام میں معاملہ بندی، شوخی اور رنگینی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اگرچہ انگریزی پران کا ایک شعر بہت مشہور ہے لیکن معشوق کے خارجی لوازم کے بیان سے جو لکھنوی شعراء کے ساتھ مخصوص ہے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ عشقیہ مضامین کے علاوہ ان کی غزلوں میں اخلاقی، صوفیانہ اور زندانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ ایک آدھ شعر میں انھوں نے قومی حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ایک شعر میں انقلاب کی توجیہ دیکھئے :-

حادثاتِ دہر ہیں وابستہ اربابِ درد لی جہاں کروٹ کسی نے انقلاب آہی گیا

عزیز کی غزلوں کا رنگ استادانہ ہے۔ فارسی الفاظ و تراکیب کے صرف پران کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کے زیادہ تر اشعار عام فہم ہیں۔ بعض اشعار کی زبان عام بول چال کی زبان کے مطابق ہے اور بعض کی اس سے بہت قریب ہے۔ موقع موقع سے محاورے کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کر جاتے ہیں۔ الفاظ، بحر اور قافیہ و ردیف کے حسن انتخاب سے کبھی کبھی ان کے اشعار میں بڑا ترنم اور فنی گہرا ہو جاتی ہے :-

شیشہ دل کو یوں نہ اٹھاؤ دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

بقول رشید احمد صدیقی فانی کا شاعرانہ آرٹ دو حالتوں کا مقابلہ کرنے میں انتہائے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ عزیز نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے

اک روز جستجو تھی کسی اور کی ہمیں یا آج ہے وہ دن کہ خود اپنی تلاش ہے

یہ وہ آنکھیں ہیں تھیں جو اک دریا نام کو اب کہیں نمی نہ رہی

دریا کبھی رواں انھیں آنکھوں سے تھا عزیز یا اب ترس رہا ہوں میں رنے کے واسطے

عزیز کی غزل گوئی میں تقلید کا عنصر کافی نمایاں ہے۔ انھوں نے اکثر اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ فارسی تراکیب کے استعمال اور معنویت پر غائب اور سوز و گداز اور سادگی میں وہ میر کی عام طور پر تقلید کرتے ہیں۔ میر و غالب کے علاوہ آتش، مومن اور داغ کے رنگ میں بھی ان کے کلام میں اشعار ملتے ہیں۔ انھوں نے صرف اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہنے اور ان کے لب و لہجہ کو اپنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ان کے خیالات کو بھی جا بجا بجنسہ یا معمولی تغیر کے ساتھ اپنی غزلوں میں منتقل کر لیا ہے۔ مومن کے رنگ میں دو شعر ملاحظہ ہوں :-

وہ شوخ فتنہ ساز کہیں بدگماں نہ ہو ناصح ہمارے حال پہ تو بدگماں نہ ہو

دنیا کو تم نہ تیز نگاہی سے دیکھنا رازِ خدا نہاں ہے تمہارے نشانے میں

دور جدید میں غزل کی اصلاح کے لئے عزیز کی غزل گوئی بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس کی تائید بھی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن عزیز کے یہاں قدرا دل کے اشعار کم ہیں۔ ان کی غزل کا دائرہ مجموعی حیثیت سے بہت محدود اور روایت میں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ چند مضامین میں جو سہجہ خیالی و بیان کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ قلمبند ہوتے رہتے ہیں تقریباً ہر غزل میں ناصح، رقیب، چارہ گز، گور غریباں اور نزع کا نزع، موت اور گور غریباں کا ذکر

ضرور موجود ہوتا ہے۔ چارہ گر، گور غریباں اور نزع کا بیان خاص طور پر انھیں اس درجہ مطلوب ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی غزل میں ان کی تکرار ہوتی ہے۔ معاملہ بندی ہو یا شوخی نزع اور موت کے عالم کو بہت کم فراموش کرتے ہیں یا یوں کہتے کہ نزع اور موت کے عالم میں بھی معاملہ بندی اور شوخی کو نہیں سمجھتے ان کو ایسے الفاظ و تراکیب سے جن کے ساتھ موت اور غم کے تصورات وابستہ ہیں بڑی دلچسپی سے لکھتے ہیں چونکہ یہ عموماً بے روح ہوتی ہیں اس لئے ان کے کلام میں ہائے کا عنصر سوز و گداز کے مقابلہ میں زیادہ غالب ہے۔ ان کے یہاں سوز و گداز مترادف ہے آہ و بکا اور الحاح و زاری لگے۔ یہی وجہ ہے کہ سوز و غم کا ذکر ہونے کے باوجود ان کے اشعار میں تیر اور فانی کا شعور غم اور اس سے پیدا ہونے والا درد و اثر عام طور پر نہیں ہے۔ یہاں عزیز بڑی حد تک ہمارے میں شاعروں کے مابند ہیں جو انقلاب کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن جن کے کلام میں انقلابی شعور مفقود ہوتا ہے۔

عزیز، غالب کے مقلد خیال کئے جاتے ہیں۔ جہاں تک فارسی تراکیب کے استعمال اور معنویت کا تعلق ہے ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے اشعار میں وہ تفکر اور ہمہ گیری شاذ و نادر ہے جس کی بدولت غالب، غالب ہیں۔ اس لحاظ سے ان کو دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی معنویت غالب کے مقابلہ میں آتش سے زیادہ قریب ہے۔

عزیز نے میر، سودا، انشا، غالب، مومن اور آتش وغیرہ کی مشہور غزلوں پر غزلیں کہی ہیں لیکن ان کی ان غزلوں میں ایسے اشعار بہت ہی کم ہیں جو ان اساتذہ کے اشعار کی برابری کر سکیں۔ اسی طرح بعض اساتذہ کے جن مضامین کو انھوں نے بجنسہ یا معمولی تغیر کے ساتھ اپنایا ہے ان میں بھی وہ کوئی قابل قدر اضافہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے مثلاً غالب کا شعر ہے :-

ہوئی جن سے توقع خستگی کی دہانے کی	عزیز کہتے ہیں :-
چارہ گر تھا جو مرے زخم جگر کا کل تک	غالب کا شعر ہے :-
اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور	عزیز کہتے ہیں :-
اڑا ہے رنگِ حنا جب سے ان کے ہاتھوں کا	سودا کا شعر ہے :-
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر	عزیز کہتے ہیں :-
اب پھینکیے یہ نول بھری تلوار پھینکیے	میر کا شعر ہے :-
ایک سب آگ ایک سب پانی	عزیز کہتے ہیں :-
سیمند میں اک جہنم آنکھوں میں ایک طوفان	یقین کا شعر ہے :-
کچھ پردہ بال میں طاقت نہ رہی تب چھوٹے	عزیز کہتے ہیں :-
آج صیاد نے فرمانِ رہائی تو دیا	مومن کا شعر ہے :-
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس	عزیز کہتے ہیں :-
ہم کو تو فکر ہے مر یا میں کسی صورت سے	مومن کا شعر ہے :-
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا	عزیز کہتے ہیں :-
دنیا کو تم نہ تیز نگاہی سے دیکھنا	مومن کا شعر ہے :-
بعدِ مدت اس کو سے یوں پھرے بنگ آکر	عزیز کہتے ہیں :-
راہیں سب شہر کی اک عمر ہوئی سب بول گیا	

اسی طرح یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ خود عزیز کے بعض اشعار میں جو مضامین ملتے ہیں ان کو ان کے معاصرین نے زیادہ موثر اور پختہ طریقہ سے نظم کیا ہے۔ چونکہ تاریخیں سامنے نہیں اس لئے یہ کہنا ناممکن ہے کہ کس نے کون سا مضمون پہلے باندھا۔ ہم صرف مضمون اشعار کے پیش کرنے میں قناعت کرتے ہیں۔

عزیز کا شعر ہے :- ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھام صبح کبھی
کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے
حسرت کہتے ہیں :- کہیں بال کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو
عزیز کا شعر ہے :- نظارہ سوزی رخ جاناں تو دیکھئے
بس اک دھواں سا اٹھ کے مرے دل میں رہ گیا
شعر مرزا نہیں ہے لیکن اسی قبیل کا قافی کا شعر ملاحظہ ہو :-

عزیز کا شعر ہے :- بجائیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل آٹھا
مل کے پٹی تھیں نکا ہیں جب کہ دھواں ملے آٹھا
اسی مضمون کو قافی یوں بیان کرتے ہیں :-
نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے

عزیز کا شعر ہے :- ہڈیاں میں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا
قافی کہتے ہیں :- ہوتا نہیں ہے کوئی زمانے میں کیا جواں
اشد کوئی حد ہے تمھارے غرور کی
عزیز کا شعر ہے :- کوئین پہ بھاری ہے اللہ سے غرور ان کا
اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے
عزیز کا شعر ہے :- دریا کبھی رواں انھیں آنکھوں سے تھا عزیز
یاد ترس رہا مول میں رونے کے واسطے
قافی کہتے ہیں :- یا ترے محتاج میں اسے خون دل
یا انھیں آنکھوں سے دریا بہہ گئے
عزیز کا شعر ہے :- ایک وہ دلکش جہاں بیٹھے خدائی جمع ہو
ایک میں بکس جہاں بیٹھوں وہاں کوئی نہ ہو
جلیل کہتے ہیں :- جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا ساتھ دے
جب تم چلو زمین پہلے آ سماں چلے

عزیز کا کلام قافیہ پیمائی، تصنع اور آورد سے بالکل پاک نہیں ہے، اگرچہ زبان اور اسالیب بیان پر انھیں اتنی قدرت ہے کہ ہمیں اس کا زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے عام طور پر اپنے اشعار کی بنیاد صنایع پر نہیں رکھی لیکن رعایت لفظی کا جسکا انھیں ہے مثلاً کہتے ہیں :-

اپنی نگاہ گرم کا جذبہ تو دیکھئے، جتنا ہو تھا دل میں مرے خشک ہو گیا
بھولے جاتے ہیں مرے پہچانے والے مجھے جب سے اس آشنا تجھ سے شناسائی ہوئی

دوسرے شعر کی بنیاد رعایت لفظی کے علاوہ بہت کچھ مومن کے اس شعر پر ہے :-

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم
اسی طرح عزیز کی غزلوں کی متین اور سنجیدہ مضامین ابتذال کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ ایک شعر دیکھتے چلیے :-

شام وعدہ آئے تو آپ اس کی فکر کیا پھر بنا دوں گا اگر زلفیں پریشاں ہو گئیں

ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ عزیز کو فارسی الفاظ و ترکیب کے صرت پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ اس کے ثبوت میں ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے کہیں کہیں ایسے ثقیل الفاظ اور نامالوس ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں جن سے شعریت کا نون ہو گیا ہے۔ مثلاً :-
”فضل رنگ آلود، طبقہ نور فریباں، واقعہ تاریخی، تعجیل مرگ، ناگہاں، بزد گفتاری، معجزہ رجعت پیمانہ، گردش طالع کی ماہیت، رگ برق پند بطور یادداشت، متکلف استغناء، قیام و قعود، شریک طوفا، حلیت صہبا، قوت تحریک، روح مقید، ترقہ، مسودہ شام، خبر طرہ تمدن، مسلح خانہ، داغ شعلہ خوار، سنگ بنیادی، شبنم رقیق القلب، آثار قدیمہ وغیرہ۔ یہ الفاظ اور ترکیبیں خواہ کتنی ہی نئی اور معنی خیز کیوں نہ ہوں لیکن غزل میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہے کہ عزیز قصیدے بھی کہتے تھے چنانچہ وقتاً فوقتاً ان کی غزلوں پر قصیدے کی پرچھائیں پڑ جاتی تھیں جس نے ان کی غزلوں کو داغدار بنا دیا ہے۔ غزل کے حدود میں یہ دھبے غالب کے ابتدائی رنگ اور ناسخ کے عام رنگ کی یاد دلاتے ہیں۔ الفاظ و ترکیب اور اسالیب بیان میں شعریت کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے عزیز کے کلام کے ایک حصہ میں شریعت پیدا ہو گئی ہے جو غزل کیا کسی بھی صنف سخن کے لئے مستحسن نہیں خیال کی جا سکتی۔ چند مسرعے ملاحظہ ہوں :-

بیہودہ صرف عمر گرامی پہ ناز ہے
وادی عمر کے ذرات کو دیکھو تو بغور
بعد استغادہ ہے یہی ہستی کا اقتضائے
نزع میں ہوں گی مری غیر ارادی باتیں
دیکھنا ہے ہم کو آثارِ قدیمہ عشق کے
نہ کیونکر فرق آئے عشق کے طرز تمدن میں
اس کو تو اطلاع تھی ان سب امور کی
ہوگا اک وقت میں یہ واقعہ تاریخی

لیکن ان کوتاہیوں سے عزیز کے کلام کی خوبیوں پر کوئی حرج نہیں آتا۔ کسی غزل گو شاعر کا کلام معائب سے خالی نہیں ہے۔ غزل کی صنف ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں کلام کی ایک سلیج ہمیشہ برقرار نہیں رہتی اور محاسن اور معائب دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں بلکہ اگر کثرت اور قلت کی بنا پر دیکھا جائے تو اکثر محاسن کے مقابلہ میں معائب کا بلکہ بھاری ہوتا ہے۔ لہذا شاعر کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لئے ہمیں صرف اس کے انتخاب یعنی اچھے اشعار سے غرض ہوتی ہے۔ عزیز کا منتخب کلام اگرچہ اس کا حجم زیادہ نہیں ہے، شعر کا ایک اعلیٰ درجہ پر پیش کرتا ہے اور جدید غزل کی نشوونما میں ان کی غزل گوئی نے مجموعی حیثیت سے جو حصہ لیا ہے اسے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

رعایتی عنوان

من ویرداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان
معہ —
جمہورستان — مکتوبات نیازتین حصہ — فرہب —
معہ —
ماہ و ماہلیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت —
معہ —
مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم — قول فیصل —
معہ —
فرست المید — نقاب اٹھ جانے کے بعد —
معہ —

میزان

عشہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول
صرف پینتالیس روپے میں مل سکتی ہیں
نیمبر نگار لکھنؤ

نگار کے پھلے فائل

(یہ تمام فائل اکٹھا فروخت ہوں گے)

۶۲۶	۶	مئی تا اکتوبر	۶
۶۲۷	=	جون تا نومبر	۶
۶۲۸	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۲۹	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۰	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۱	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۲	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۳	=	جنوری تا جون	۶
۶۳۴	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۵	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۶	=	جنوری تا دسمبر	۶
۶۳۷	=	جنوری تا جون	۶
۶۳۸	=	جنوری تا جون	۶
۶۳۹	=	جولائی تا اکتوبر	۶
۶۴۰	=	جنوری تا نومبر	۶
۶۴۱	=	جنوری تا جون	۶
۶۴۲	=	جولائی، اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر	۶

نیمبر نگار لکھنؤ

فلاسفہ کا تصور

(محمد عباس طالب صفوی)

ہمارے فاضل دوست نواب محمد عباس طالب صفوی، بڑے بلند و پاکیزہ ذوق کے علم دوست انسان ہیں۔ ان کا مطالعہ تاریخ، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات بہت وسیع ہے اور وہ ہمیشہ کسی نہ کسی ریسرچ میں مشغول رہتے ہیں۔ زیر بحث مقالہ بھی ان کی اسی عالمانہ تحقیق کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے خدا کے تصور پر تاریخی و فلسفیانہ گفتگو کی ہے یہ مقالہ دراصل ایک مستقل کتاب ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں بالکل پہلی کتاب جس میں فلسفہ کی خامص اصطلاحات سے ہٹ کر عوام کے سمجھانے کے لئے نہایت سادہ الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ مقالہ بالاقساط نگار میں شائع ہوتا رہے گا اور اس کا سلسلہ غالباً ۱۰ حصے تک جاری رہے گا۔ پہلی قسط میں انھوں نے یونانی فلاسفہ کو لیا ہے، اس کے بعد وہ یہودی، ہندو، عیسائی اور مسلمان فلاسفہ کے ”تصور خداوندی“ کی توضیح فرمائیں گے ہمیں امید ہے کہ ارباب نظر بغور اس کا مطالعہ فرمائیں گے اور اگر کسی مسئلہ میں انھیں جناب طالب صفوی سے اختلاف ہوگا تو اس کو آزادی سے ظاہر کر دیں گے۔

نیاز

فلسفہ قدیم و جدید کے متعلق انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں کا کیا ذکر خود اردو میں سو کے قریب معیاری کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود مابعد الطبیعیات کے موضوع پر کوئی ایسی جامع و مانع کتاب موجود نہیں جس میں فلسفہ سے ناواقف حضرات کے لئے سہل زبان میں فلاسفہ قدیم و جدید کے متبائن نظریات پیش کئے گئے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ عوام کے لئے ہر دور میں تمام فلسفیانہ مسائل علی العموم، اور مابعد الطبیعیات کے مسائل علی الخصوص ناقابل فہم رہے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ خالص فلسفیانہ مضامین کا سمجھنا آسان نہیں ہے، لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ فلسفیانہ نظریات جو عہدِ تاریک میں مذہب کے خون سے مروزات میں بیان کئے جاتے تھے علم و فضل کے اس عصر میں بھی جبکہ اظہار خیال میں کوئی مانع نہیں ہے، متقدمین کی غیر شعوری تقلید میں مبہم الفاظ میں ادا کئے جاتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے عوام کو خاص بھی مابعد الطبیعیات کے متعلق کوئی حتمی اور قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے اور عالمانہ تحقیق و تفتیش کے بجائے اپنے قومی یا انفرادی رجحانات کو دوسرے نظریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان کے ارباب فکر کا پہلا طبقہ ان اصحابِ نظر پر مشتمل ہے جو عیسائی، مسلمان (Schoolmen) کی طرح فلسفہ کو مسخ کرنے کے بعد مذہب کے مطابق ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس طبقے کے خاص نمائندے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیات کے پروفیسر اور حضرات اہل تشیع کے مجتہد مولانا علی نقی صاحب ہیں۔

۱۔ ”انواع فلسفہ“ مترجمہ مظفر حسین خان مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۲۸-۲۱۵۔

۲۔ ”Guide to Philosophy“ By Dr. Joad page 11

۳۔ ”A Rationalist Encyclopaedia“ By McCabe p. 526

موصوف نے فلسفہ یونان کو مدرسین یعنی امام فخر الدین رازی اور علامہ نصیر الدین طوسی کی عینک سے دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ تمام کائنات کے اور واجب الوجود کو ماننا اور خدا کو تسلیم کرنا دونوں باتیں لازم و ملزوم ہو گئیں۔ مذکورہ بالا بنیادوں پر خدا کی تصدیق حاصل کرنے کے دو راستے ہو گئے ایک ممکنات کے ماوراء واجب الوجود کی ضرورت ثابت کرنا یہ فلاسفہ کا راستہ ہے۔ دوسرے مخلوق کے لئے خالق کی ضرورت ثابت کرنا یہ متکلمین کا راستہ ہے اور چونکہ پہلا راستہ اصطلاحات کے وزن سے زیادہ بوجھل ہے اس لئے خواص ہی کے دماغ کو زیادہ متوجہ کر سکتا ہے اور دین خواص و عوام سب کے لئے ہوتا ہے اس لئے رہنمایان دین نے زیادہ تر دوسرے طریقے کو اختیار کیا ہے اور قرآن و حدیث میں بیشتر اس رخ سے استدلال نظر آتا ہے لیکن نتیجے میں دونوں راہیں ایک ہی منزل پر پہنچتی ہیں۔

حالانکہ دراصل منزلیں دو ہیں اور دونوں منزلوں میں بعد المشرقین ہے یعنی جبکہ مذہب ایک ایسے خالق کے وجود کو تسلیم کرتا ہے جس نے لاشیے سے کائنات کی تخلیق فرمائی، فلاسفہ کا کوئی مدرسہ ایسا نہیں ہے جو خدا کو مدبر یا محرک ماننے کے بجائے خالق کائنات تسلیم کرتا ہو یعنی ان مادیات سے صرف نظر کرنے کے بعد جو خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں قائلین وجود کی ایک کثیر تعداد یا تو اس تمام کائنات کو خدا سمجھتی ہے اور یا پھر کائنات کو ازلی اور ابدی کے ماننے کے باوجود ایک ماوراء کائنات خدا کو اس کائنات کا محرک اول تو تسلیم کرتی ہے لیکن اس خدا کے وجود کے ساتھ ساتھ ۴۵ یا ۵۵ غیر متحرک محرکوں کے وجود کا بھی اقرار کرتی ہے۔

ہندوستان کے اصحاب فکر کے دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ فلسفہ ما بعد الطبیعیات کے دقیق مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے لیکن تصوف (جیسے وہ اپنی نیک نیتی کی بنا پر فلسفہ یونان کی وجدانی شدخ تسلیم کرنے کے بجائے ایک اسلامی علم سمجھتے ہیں) تسکین روح کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس گروہ کے دو ممتاز نمائندے مولانا ابوالکلام آزاد و وزیر معارف اور علامہ نیاز فتح پوری ہیں۔

مولانا آزاد کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں: ”مذہب تک غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت اسلامیہ کے تمام مفاسد و معائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ سارے برک و بار و ثمرات فساد کو انھیں سے ظہور و نمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسماصل و اساس علوم شرعیہ پڑھتے اور پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل و تفسیر کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعت اسلامیہ و دین النجاس سے مرکب ہے اور کس قدر اسی فتنہ عالم آشوب یونانیت و عجمیت سے؟ کوئی شے اس سے نہ بچی حتیٰ کہ علما علوم الہیہ و عربیت و بلاغت و بیان اور علمائے جزئیات اعمال و رسوم و ہیئات و معاشرت و غیر ذلک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ امام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر اہام و وسائیل خزعبلات و مہفوات کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقب شریف معقولات پکارا جاتا ہے؟ و ان من العلم جہلاً عر برعکس نہ ہند نام زندگی کا نور۔ لیکن ”یونانیت و عجمیت“ سے منفر مولانا ابوالکلام آزاد اسی تصنیف میں نہ صرف اپنے ان بزرگوں کا تذکرہ فرماتے ہیں جو ”اصحاب طریقت و سلوک میں سے تھے“ بلکہ صاحبان طریقت و سلوک کے اقوال عجیبہ کی و تاویل بھی کرتے ہیں کہ ”اصل یہ ہے کہ اصحاب احوال و طریق کے معاملات کچھ عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں اور یہ تو ہم اپنے کلمات و اقوال غریبہ کے لئے بہت سے عذرات پیش کرتی ہے۔ اہل حق و انصاف نے ان عذرات کو قبول کیا ہے مگر جو لوگ ذوق حقیقت سے محروم اور سبک الفاظ و صورت میں مجوس ہیں ان کا فہم ناراضا ہاں تک نہیں پہنچتا اور ”رایت اسدائیری“ سن کر شیر کے نیچے اور ناخن ڈھونڈنے لگتے ہیں۔“

۱۔ ”قرون وسطیٰ کا اسلامی فلسفہ“ مصنفہ گولڈ سیبر مترجمہ وحید الدین صفحہ ۴۲

۲۔ اخبار ”پیام اسلام“ مورخہ یکم جولائی ۱۹۵۵ء صفحہ ۲ کا نم ۴

۳۔ Aristotle. By Doctor Ross page 184

۴۔ A History of Western Philosophy By Russell p. 191

۵۔ ”تذکرہ“ مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔

مولانا آزاد تصوف کو مذہب سے علیحدہ نہیں تصور فرماتے ہیں لیکن علامہ نیا ز تصوف کو صحیح طور پر مذہب سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور دیدہ و دانستہ تصوف کو ان الفاظ میں مذہب پر ترجیح دیتے ہیں۔ "الغرض خدا کے وجود سے انکار ممکن نہیں لیکن اہل مذہب اس کا اقرار کرتے ہیں اس طرح کہ عقل کو انکار کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہیں سے دنیا میں نزاع کفر و دین کی ابتدا ہوتی ہے۔ خدا نام نہ ایک ازلی قوت کا جس کا بہترین تصور اہل مذہب میں نہیں بلکہ صوفیہ کے یہاں پایا جاتا ہے۔"

ہندوستان کے اہل فکر اصحاب کی تیسری جماعت ان حضرات پر مبنی ہے جو خود فلسفی ہیں۔ اس جماعت کے ممتاز ترین نمائندے جمہوریہ ہند کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کبھی فلسفیانہ نظریات کے تحت خود خدا کو کامل نہیں سمجھتے ہیں کبھی اسے کمال محض کے فلسفیانہ نام سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی صریح الفاظ میں عقاید کی صحت کا یوں اعتراف فرماتے ہیں کہ "وجدان - عقیدہ - روحانی تجربے یا الہامی کتابوں کے ضروریات علم اور زندگی کے لئے لازمی ہیں۔"

درج بالا متضاد آراء کی توجیہ ہمارے عصر کے سب سے بڑے منکرین خدا فلسفی لارڈ برٹنڈ رسل کے ان الفاظ سے اس طرح کی جاسکتی ہے کہ افلاطون کے عصر سے اب تک اکثر فلاسفہ نے عقلی روح اور ثبوت خدا کے دلائل پیش کرنا اپنا فرض سمجھا اور انہوں نے ہمیشہ اپنے پیروؤں کے استدلال کو رد کرنے کے لئے دلائل پیش کرنا مناسب سمجھا۔ سینٹ ٹامس نے سینٹ انسلم کے دلائل کی تردید کی اور کانٹ نے دے کانت کی دھجیاں ڈالیں ان دلائل کو معقول ثابت کرنے کے لئے فلاسفہ نے منطق کی تکذیب کی فلم الحساب کہ علم الاسرار بنا ڈالا اور دساوس کو وجدان کا لقب دیا۔ جامع اوراق نے ان تمام فلاسفہ کے متبائن خیالات کو عام فہم زبان میں پیش کیا ہے تاکہ فلاسفہ سے ناواقف حضرات بھی مولانا آزاد کے المقام میں اس "فتنہ عالم آشوب" کی ایک جھلک دیکھ لیں جسے منکرین خدا مذہب کی ٹوٹی سمجھتے ہیں اور قائمین خدا مذہب کا سب سے بڑا دشمن سمجھنے کے باوجود مذہب کا سب سے بڑا دوست بھی سمجھتے ہیں!

طالب صفوی

یونانی فلاسفہ

(۱) متقدمین جیسا کہ اوراق آئینہ میں دکھایا جائے گا یہود و ہنود کو فلسفہ کا موجد ہونے کا دعویٰ ہے لیکن چونکہ ان پر دیش کے سابق گورنر شری کے ایم۔ منشی نے میرے استفسار کے جواب میں تصریح فرمائی ہے کہ چونکہ وہید مقدس اور گیتا ہزاروں برس تک قید تحریر سے آزاد رہے بنا براین ان کے کسی قدیم مستودے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (موصوف کا نجی خط مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۵۶ء) اور

۱۔ رسالہ ننگار اپریل ۱۹۵۴ء صفحہ ۵۰

"An Idealist View of Life" By S. Radha Krishnan p. 336

"Recovery of Faith" By S. Radha Krishnan page 90

"An Idealist View of Life" page 174

"A History of Western Philosophy" page 863

"A Rationalist Encyclopaedia" page 451

"Mysticism in Religion" By Dr. Inge page 106

چونکہ برٹش میوزیم کے کیمپ نے اپنے ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کے گرامی نامہ میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ عہد نامہ عتیق کا قدیم ترین کامل نسخہ جو تقدس آباد پوپ کے کتب خانہ میں ہے پوٹھی صدی عیسوی کا بتایا جاتا ہے۔ موصوف کی نظر میں تورات اقدس کا قدیم ترین ناقص جزو انجیل کی جانب لائبریری میں موجود ہے اور یہ جزو دوسری صدی قبل مسیح میں معرض تحریر میں لایا گیا تھا اور چونکہ برٹش میوزیم کے شعبہ مسودات کے ڈپٹی کیمپسٹر ٹی۔ سی۔ اسکیٹ نے میرے استفسار پر اپنے خط مورخہ ۳ جون ۱۹۵۷ء میں یہ توضیح فرمائی ہے کہ افلاطون کے تصانیف کے بعض اجزاء تیسری صدی قبل مسیح کے لکھے ہوئے اب تک موجود ہیں لہذا اس امکان کو مد نظر رکھنے کے باوجود کہ مصر اور ہندوستان میں یونان سے قبل فلسفہ رائج تھا تحریری شہادت کی بنا پر تقدم زمانی کا شرف یونان کے حصہ میں آئے گا۔

طالیس کو یونانی فلسفے کا بانی سمجھا جاتا ہے مگر نہ تو اس کے سوانح حیات محفوظ ہیں اور نہ مسودات لیکن چونکہ متاخرین کی کتابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ۵۸۵ء قبل مسیح کے سورج گرہن کی پیش بینی کی تھی اور دریا کے رخ کو اس طرح موڑا تھا کہ کینخس کی افواج دریا کو عبور نہ کر سکی تھیں لہذا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ طالیس مہیت اور علم الحساب سے واقف تھا اور اس کی مدت حیات ۶۲۵ء ق۔ م سے ۵۴۵ء ق۔ م تک تھی۔

اسی طرح متاخرین کی شہادت پر یہ مان لیا گیا کہ طالیس کے نزدیک کائنات کی اصل پانی ہے اور ہر شے آخر میں پانی ہو جائے گی جسے یونان کے پہلے فلسفی نے صاحب ارادہ دیویوں اور دیوتاؤں کے بجائے لاشعور پانی کو اصل کائنات قرار دے کر مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور پروفیسر الفریڈ ویبر کے الفاظ میں ”مروجہ مذہب کے خلاف مسلسل ایک ہزار برس تک بغاوت کرنے کے بعد بالآخر چوتھی صدی عیسوی کے بعد فلسفہ اپنی تباہ کاریوں سے خائف ہوا اور فلاطینس کے جانشینوں کے عصر میں فلسفہ مذہب کا جانی دشمن ہونے کے بجائے یونان کے دیوتاؤں کا طرفدار بن گیا اور چرخ کا خادم ہونے سے قبل فلسفہ یونان اور یونانی علم الاصلام کا گرویدہ ہو گیا“ بالفاظ دیگر فلاسفہ مادیین ہو یا فلاسفہ روحانیین سب کا منہج نظر مذہب کی مخالفت کرنا تھا۔

طالیس کی طرح انیکسی منڈر بھی حکومت یونان کے صوبہ ایشیائے کوچک کی یونانی نوآبادی ٹائلٹس کا رہنے والا تھا اور اگرچہ اس کی تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں ہے تاہم یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ۶۲۵ء ق۔ م میں ساٹھ برس کا تھا۔ وہ طالیس کے برعکس پانی کو جو ہر اول نہیں مانتا تھا بلکہ اسطو کے قول کے مطابق اس کے نزدیک عناصر ثلاثہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یعنی ہوا سرد ہے پانی مرطوب ہے اور آگ گرم لہذا اگر ان تینوں چیزوں میں سے کوئی شے جو ہر اول ہوتی تو وہ دوسرے عنصروں کو مغلوب کر لیتی۔

"History of Philosophy Eastern & Western" Edited By Radha Krishnan vol I
page 14

Ibid page 19

"A Critical History of Greek Philosophy" by Professor Stace pp. 20-21.
"A History of Philosophy" By Professor Webb
page 13

"History of Philosophy" By Professor Alfred
Weber page 139.

A History of Western Philosophy By Russell
pages 45-46.

انیکسی منڈر کے نزدیک "تمام اشیاء کا آغاز ایک لامحدود مادے سے ہوا۔ تمام چیزیں اسی مادے سے ابھرتی ہیں اور تباہ ہو کر دوبارہ اسی میں مل جاتی ہیں۔ اس ابتدائی مادے کو وہ نہ تو چار عناصر پر مشتمل سمجھتا ہے نہ کوئی ایسا جو ہر خیال کرتا ہے جو ہوا اور آگ یا ہوا اور پانی کے بین میں ہے اور نہ ایسے مخصوص جو اہر کا مرکب تصور کرتا ہے، جس کے اندر یہ عناصر معین طور پر موجود تھے۔ تھیوفراستس کے بیان سے اور ارسطو کے اقوال سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انیکسی منڈر یا تو وجود لامحدود کو تمام مادی جو اہر سے الگ خیال کرتا تھا یا اس کی مخصوص ماہیت کی نسبت اسے کچھ بیان نہیں کیا یا اس کی مراد عام مادے سے تھی نہ کسی خاص مادے سے۔ اس کا استدلال یہ تھا جو یقیناً غلط تھا کہ ابتدائی مادہ لامحدود ہونا چاہئے ورنہ وہ اشیاء کے بنانے میں خرچ ہو کر ختم ہو جاتا۔" ^۱

انیکسی منڈر کے اس الہام سے انیسویں صدی عیسوی کے مشہور فلسفی ہیکل کو یہ اشتباہ ہوا کہ انیکسی منڈر کا لامحدود مادی نہیں ہے بلکہ فلاسفہ متاخرین کے واجب الوجود کے مانند ہے لیکن پروفیسر فرینک ٹیلی کے الفاظ میں "ہیکل نے غلطی کی حقیقتاً انیکسی منڈر کا لامحدود ایک ٹھوس اور غیر معین مادہ ہے۔" ^۲

ماکل ٹس کا تیسرا اور آخری فلسفی انیکسی منڈر تھا جس کا زمانہ حیات ۵۲۲ - ۵۸۸ ق م تھا۔ اس کی تصنیف کا ایک نام جزو محفوظ رہا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طالیس کی طرح اصل اول کو معین بھی کہتا ہے اور انیکسی منڈر کے تتبع میں اسے غیر محدود بھی سمجھتا ہے۔ انیکسی منڈر کے نزدیک اصل اول ہوا ہے۔ ہوا کی وسعت فضا میں لامحدود ہے اس میں مسلسل حرکت اور تغیر بھی موجود ہے اور جانداروں میں ہوا حرکت اور زندگی کی اساس ہے۔ انیکسی منڈر کا یہ نظریہ ڈاکٹر ویلیئم نیسل کے خیال میں اس "نمیاتی عقیدے کا آئینہ دار ہے کہ روح ایک ذراتیات ہوا ہے۔" ^۳

ماکل ٹس (مطلہ) کا مدرسہ خیال لارڈ برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں "یونان بابل اور مصر کے ثقافتی تعلقات کا نتیجہ تھا اور چونکہ جس صوبے میں یہ شہر واقع تھا وہ دارا کے حملے تک یونانی دنیا کا اہم ترین حصہ تھا اور چونکہ ایونیا میں نہ دیونیس کی مذہبی تحریک کا کچھ اثر تھا نہ آرفیس کے مذہب اسرار کا بلکہ خود اولمپک مذہب کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی بنا بریں ملٹی فلاسفہ کے نظریات صرف سائنس سے وابستہ تھے اور اخلاقیات سے کوئی خاص واسطہ نہیں رکھتے تھے۔" ^۴

بہرینچ ایرانیوں نے اس ابتدائی مرکز فلسفہ کو تباہ و برباد کر دیا لیکن "اس وحشیانہ فتح کے بعد بھی چراغ علم گل نہیں ہوا بلکہ ایونیا کے پناہ گزینوں نے حکومت یونان کے مغربی حصص میں وسیع تر پیمانہ پر تحقیق کا کام شروع کر دیا اور اس طرح فیثا غورٹی اسکول معرض وجود میں آیا۔" ^۵

(۲) فیثا غورث

ایونیا کے آزاد مشرب صوبے کے برعکس جنوبی اٹلی کی اس یونانی نوآبادی میں جو ایونیا کی شکست کے بعد فلسفہ کا مرکز بنی تھی مذہب سے کافی شغف موجود تھا لہذا مخالفت کے باوجود فلسفہ مذہب سے اور مذہب فلسفہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مغربی یونان میں چھٹی صدی قبل مسیح میں تین مذاہب رائج تھے اولاً اولمپین مذہب جو دو ہزار برس قبل مسیح سے موجود تھا اور جس کے پیشوا

۱۔ "مختصر تاریخ فلسفہ یونان" مصنف ڈاکٹر نیسل مترجمہ ڈاکٹر عبدالحکیم ص ۲۹

۲۔ "A History of Philosophy" By Frank Thilly page 26

۳۔ "A Critical History of Greek Philosophy" p. 28.

۴۔ "مختصر تاریخ فلسفہ یونان" صفحہ ۳۱

۵۔ "A History of Western Philosophy" page 47

"History of Ancient Philosophy" By A.W. Bennet

— page 8.

دیوی اور دیوتا انسانوں کی صفات سے متصف سمجھے جاتے تھے یعنی جنگ جو قبائلی سرداروں کی طرح وہ جنگ کے نقشے بناتے تھے شراب پیتے تھے رقص کرتے تھے جنسی تعلقات کے دلدادہ تھے اور اخلاقی اقدار کے حامل نہیں تھے بلکہ مشہور شاعر ہومر کے قول کے مطابق خود زیوس جو دیوتاؤں کا باپ سمجھا جاتا تھا اتنا متلون المزاج تھا کہ ایک دن میں باری باری سے دو متضاد فوجوں کا ساتھ دیتا تھا۔ دوسرے مذاہب کے برعکس اولمپین مذہب کے معتقدین کے نزدیک ان کے دیوتاؤں نے کائنات کو خلق نہیں کیا تھا بلکہ ازل کی کائنات کو مسخر کیا تھا۔ اس اہم عقیدے کا فلسفہ پر بھی یہ اثر پڑا کہ کوئی یونانی فلسفی تخلیق کائنات کا قائل نہیں ہوا۔

اولمپین مذہب کا دوسرا اہم عقیدہ تثلیث کا تھا جس کا اثر عصر حاضر کے فلاسفہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ مہیسی آڈ کے خیال میں صوب سے پہلے عدم نظام یا صرف ابتری تھی اور اس کے بعد زمین۔ آسمان اور ایراس معروض وجود میں آئے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے غیر متعلق تھے لیکن ایراس یعنی عشق نے انہیں ربط باہمی پیدا کر دیا۔ ایراس کے عقیدے نے بھی فلسفہ کو کافی متاثر کیا۔ مذہب کے علاوہ دوسرا مذہب جو زراعتی طبقوں میں رائج تھا ہرمز اور پان کی پرستش کا مذہب تھا۔ چونکہ کاشتکار بالعموم مفلس تھے اور ان کے پاس گائے بیل نہیں تھے لہذا وہ بکری کو خوش حالی کا معیار تصور کرتے تھے اور پان دیوتا کی پرستش کے باوجود جب کبھی قحط سالی سے دوچار ہوتے تھے تو پان کے مجسمے کو مارا کرتے تھے۔ پان دیوتا کو بعض محققین کے نزدیک پہلے پائون کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جس کے معنی مظہم اور گدہ بان کے ہیں لیکن جب پانچویں صدی قبل مسیح میں یان دیوتا کی پرستش تھینز میں رائج ہوئی تو پائون کو پان کے نام سے یاد کیا جانے لگا جس کے معنی ہمہ خدا کے ہیں۔ میری رائے میں انگریزی زبان میں ہمہ اوست کے قائلین کے لئے جو لفظ پان تھی اسٹ استعمال کیا جاتا ہے وہ اسی پان دیوتا کے معنی سے مشتق ہے۔

قدیم یونان کا تیسرا مذہب دیونی سس کی پرستش کا تھا جسے شراب کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور جس کی پرستش تھریس کے صوبہ سے شروع ہو کر تمام یونان میں رائج ہو گئی تھی۔ دیونی سس کو بکیس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا اور یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ اُس کی شکل انسانی تھی یا حیوانی۔ اس کے پرستار وحشی جانوروں کو چیر بھاڑ کر کچا کھا جاتے تھے اور اس کی ماننے والی عورتیں دیران پہاڑیوں میں تمام رات شراب کے نشہ میں ناچتی رہتی تھیں۔ دیوانی سس کا مصلح ایک غیر تاریخی شخص آرفیس تھا جس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بین بجا کر نہ صرف انسانوں کو بلکہ دیوتاؤں تک کو مسخر کر لیتا تھا۔ خود آرفیس کی تعلیمات کے متعلق تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے متبعین کے عقاید کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے وصل بالحق کے کیفیت کو شراب کے نشہ پر ترجیح دی اور مذہبی مراسم کے علاوہ صرف شراب سے محترم رہے بلکہ ہر قسم کی حیوانی غذا سے بھی اجتناب کیا۔ یہ تنازع کے بھی قائل تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ روح مرنے کے بعد عارضی یا دائمی عذاب یا ثواب میں مبتلا ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا ایک جزو ارضی ہے اور ایک سماوی لہذا اگر انسان دنیا میں زاہدانہ زندگی

- | | | |
|--|---------|---|
| "The Concept of Deity" By Dr. E.O. James | page 40 | ۱ |
| "A History of Western Philosophy" | page 30 | ۲ |
| "A Critical History of Greek Philosophy" | page 71 | ۳ |
| A History of Philosophy By Thilly | page 11 | ۴ |
| "A History of Western Philosophy" | page 32 | ۵ |
| "A History of Philosophy" By Thilly | page 14 | ۶ |
| "A History of Western Philosophy" By Russell | p. 33 | ۷ |
| "A History of Philosophy" By Thilly | page 14 | ۸ |

پس کرسے تو اس کا سماوی جز و ترقی پذیر ہو جائے گا اور انسان ہیگس دیوتا کا وصل حاصل کر کے خود ہیگس ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کارڈن کلاک صدر شعبہ فلسفہ بھارتیہ یونیورسٹی کے نزدیک جس زمانہ میں ایونیا کے مرکز فلسفہ کے تباہ ہونے کے بعد جنوبی اٹلی میں ایک نیا مرکز فلسفہ قائم کیا گیا اس عصر میں اومپتین دیوتاؤں کے بجائے مذہب اسرار کا اقتدار تھا اور ایونیا کے مشرقی مدرسہ فلسفہ اور جنوبی اٹلی کے مغربی مدرسہ فلسفہ ہیں باین معنی بعد المشرقین تھا کہ ایونیا کا مدرسہ فلسفہ طبیعیات اور سائنس پر مبنی تھا اور جنوبی اٹلی کا مدرسہ فلسفہ مذہب اسرار اور علم الحساب پر جنوبی اٹلی کے اس نئے مدرسہ فلسفہ کا بانی فیثاغورث کی نیم تاریخی ہستی کو سمجھا جاتا ہے جسے کبھی اپانودیوتا کا فرزند کہا جاتا ہے اور کبھی انسان کا۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی شایع کردہ تاریخ فلسفہ میں پروفیسر رانا ڈے ساہن پر پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی اور شری آریا بھن کول ریڈیہ الہ آباد یونیورسٹی نے کسی کتاب کا حوالہ دے بغیر رائے قائم فرمائی ہے کہ فیثاغورثی جماعت ابتداً ایک مذہبی سوسائٹی تھی نہ کہ ایک سیاسی جماعت حالانکہ محققین کا خیال اس کے برعکس ہے کہ فیثاغورث کو فلسفہ ق۔ م کے قریب اپنے وطن کو چھوڑنا ہی اس بنا پر پڑا کہ فیثاغورث پالی کرش کے مظالم کے خلاف طبقہ امراؤ کا طرفدار تھا اور جب اُس نے اپنے وطن یعنی جزیرہ ساموس کی سکونت ترک کر کے کروٹونا میں اپنی دیوسویشن قائم کی تو اس جماعت کا مقصد اخلاقی اور مذہبی انقلاب کے ساتھ سیاسی انقلاب پیدا کرنا بھی تھا اور انھیں سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے خود فیثاغورث کو کروٹونا چھوڑنا پڑا۔ بلکہ فیثاغورث کی وفات (سنہ ۵۰۰ ق۔ م) کے ساٹھ برس کے بعد فیثاغورثی جماعت نے ایک قلیل مدت کے لئے کروٹونا کی حکومت پر بھی قبضہ کر لیا تھا جہاں کے عوام نے سنہ ۴۸۰ ق۔ م۔ اور سنہ ۴۷۰ ق۔ م کے درمیان فیثاغورثیوں کے راہبانہ احکام سے گھبرا کر نہ سرن ان کے جماعت نمائے کو جلا ڈالا بلکہ فیثاغورثیوں کو قتل کر دیا گیا یا جلا وطن۔

فیثاغورث کی سیاسی سرگرمیوں کے برعکس اُس کی فلسفیانہ تعلیم کا حال پردہ خفا میں ہے اور ڈاکٹر ویلیم نیسل کے الفاظ میں اس عدم تہیق کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ "فیثاغورث کے تاریخی حالات بہت پہلے ہی سے غیر تاریخی افسانوں کے ساتھ مل جل گئے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا روایتیں اور زیادہ موضوع ہوتی گئیں۔ فیثاغورث کی تعلیم میں جدید فیثاغورثی اسکول کے علاوہ اور جعلی تصانیف کی کثرت کے بعد موضوع عناصر اس طرح غلط ملط ہو گئے کہ حقیقی کو غیر حقیقی سے جدا کرنا نہایت مشکل کام ہو گیا ہے۔"

بہر نوع یہ امر یقینی ہے کہ ماٹھ کے فلاسفہ کا نظریہ طبیعی تھا یعنی وہ مادی اسٹیاؤ کو کائنات کی اصل سمجھتے تھے اور فیثاغورث کا نظریہ ابوریطینی تھا یعنی اُس کے نزدیک کائنات کی اصل روحانی تھی۔ وہ دیوتاؤں کے عقیدے کے ساتھ اعداد پر بھی یقین رکھتا تھا اُس کا خیال تھا کہ کائنات کی تشکیل اعداد سے شروع ہوئی اور یہ امر مرکز کی آگ ہے۔ اس آگ نے لامحدود کے قریب ترین حصوں کو

- "A History of Western Philosophy" By Russell p. 35
 "A History of Philosophical Systems" By
 Prof. Vergilius Ferm page 73
 "A History of Western Philosophy" page 48.
 "History of Philosophy Eastern & Western" vol II p. 33
 "A History of Philosophy" By Thilly pages 27-28.
 "A History of Western Philosophy" B. Russell p. 49
 "A Critical History of Greek Philosophy" By Socrates p. 33
 مختصر تاریخ فلسفہ زبان مضموع حیدر آباد دکن سنہ ۱۳۳۲-۳۳
 "History of Philosophy" By Alfred Weber page 23

اپنی طرف کھینچا اور محدود کیا اور یہی دیوتا کا قلم ہے۔ کائنات کے تمام اشیاء مثلاً نر و مادہ - خیر و شر - محدود و لامحدود - طاق اور جفت یا بالفاظ دیگر وحدت اور کثرت کے آئینہ دار ہیں لیکن خود وحدت مطلق نہ طاق ہے نہ جفت بلکہ شاید یوں کہنا مناسب ہو کہ طاق بھی ہے اور جفت بھی واحد بھی ہے اور کثیر بھی، خدا بھی ہے اور کائنات بھی۔ فیثاغورث بقائے روح کا بھی قائل تھا اور تناسخ کا بھی لیکن اس کے باوجود اس نے صرف مذہب اسرار کے مابعد الطبیعیات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مذہب اسرار کے غوامض کے ساتھ سائنس کے نظریات کو بھی پیش نظر رکھا اور زیوس دیوتا کے اقرار کے باوجود کائنات کو ازلی اور ابدی سالمات کا مجموعہ سمجھا۔ مذہب اسرار اور سائنس کے اس اجتماع کا نتیجہ نکلا کہ مشرق کے ویدانت اور تصوف کے برعکس یونان کا فلسفہ کبھی بھی بالکل سائنس سے منحرف نہیں ہوا۔

(۳۷) **زمینوفینیز** کے عصر تک کسی فلسفی نے علی الاعلان مذہب کے دیوتاؤں کی تحقیر نہیں کی تھی لیکن چونکہ پانچویں صدی قبل مسیح میں خود یونان سے افضل، خیر و شر سے بالاتر اور تمام اشیاء پر محیط سمجھے گئے تھے۔ لہذا زمینوفینیز (۴۸۰ - ۴۰۷ ق۔ م) میں بھی یہ جرات پیدا ہوئی کہ اس نے علی الاعلان دیوی دیوتاؤں کی مذمت کی اور چونکہ دیوی دیوتاؤں کی داستانیں اکثر نظم میں بیان کی جاتی تھیں لہذا زمینوفینیز نے بھی اپنے تمام فلسفیانہ خیالات صرف نظم میں بیان کئے۔ شاعری اور فلسفہ کا یہ امتزاج کم از کم وحدت الوجود کے قائلین میں باقی رہا اور نثر ہو یا نظم دنیا کے ہر ملک کے ادب میں قائلین ہمہ اوست نے اپنے افکار سے جان ڈال دی۔

زمینوفینیز کا اہم نہایت تلخ تھا اور تعجب ہے کہ انداز بیان کی اس تلخی کے باوجود یونانی مذہب کے علم برداروں نے اسے کوئی سزا نہیں دی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ مذہب کے علم بردار اسے زیوس دیوتا کی محبت میں سرشار سمجھتے ہوں۔

زمینوفینیز نے اپنی ایک نظم میں نہ صرف دیوی دیوتاؤں کا مذاق اڑایا ہے بلکہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے والوں پر بھی اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہو خدا اور یہی آؤںے دیوتاؤں کی طرف وہ افعال منسوب کئے ہیں جو دیوتاؤں کا کیا ذکر فانی انسان کے لئے بھی شرم و ذلت کا باعث ہیں یعنی چوری - زنا اور قریب - انسان دیوتاؤں کے توالد و تناسل - پوشاک - آواز اور جسم کو بالکل انسانوں کی طرح سمجھتا ہے لیکن اگر ہیل اور گھوڑے اپنے خیالات کو بیان کر سکتے تو جس طرح جہشی اپنے دیوتاؤں کو سیہ فام اور چھپیٹا ہوا والا اور تقریب کے رہنے والے اپنے دیوتاؤں کی آنکھیں مٹی اور بال لال سمجھتے ہیں اسی طرح جیل اپنے دیوتاؤں کو ہیل کی صفات سے متصف اور گھوڑا اپنے دیوتاؤں کو گھوڑے کی صفات کا حامل بیان کرتا۔

زمینوفینیز ہر شے کی خلقت زمین اور پانی سے سمجھتا تھا لیکن وہ ایک ایسی ہستی کا بھی قائل تھا جو ہمہ چشم ہمہ گوش اور ہمہ فکر ہے۔ یہ ہستی ازلی اور ابدی ہے اور ایک خاص جگہ رہتی ہے۔ من حیث الوجود یہ ہستی غیر متحرک ہے لیکن اس ہستی کے حصوں میں حرکت بھی ہے اور تغیر بھی۔ یہ ہستی ان انسانوں میں لامحدود ہے کہ اس ہستی کے علاوہ کوئی اور وجود نہیں لیکن اس طرح محدود بھی ہے کہ یہ ہستی خود ایک کرہ ہے۔ یہ ہستی ایک ہے اور اس کا جسم اور درخ انسانوں سے قطعاً مختلف ہے اور وہ ابدی ہستی تمام اشیاء پر اپنی دماغی فکر سے نگاہ رکھتی ہے۔ باوی النظر میں ان صفات سے موصوفین

۱۔ "مختصر تاریخ فلسفہ یونان" صفحہ ۴۰۔

"History of Philosophy" By Weber page 24

"A History of Western Philosophy" By Russell p. 41

"Concept of Deity" By Dr. James p. 41

"A Critical History of Greek Philosophy" By Stacep. 41

"A History of Western Philosophy" By Russell p. 59

"A History of Philosophy" By Thilly page 36

کے خدا کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے حکومت ہند کی شایع کردہ تاریخ فلسفہ کے مولفین نے زینوفینز کو لا الہ الا اللہ کا قائل اور موجد سمجھا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

زینوفینز کے نزدیک یہ واحد ہستی نہ کوئی روح ہے اور نہ کائنات سے علیحدہ کوئی شے بلکہ کائنات کے مجموعہ کا نام ہی خدا ہے۔ بنا بریں پروفیسر اسٹیس کے الفاظ میں یہ سمجھنا قطعاً غلط ہوگا کہ زینوفینز کسی ایسی ہستی کا قائل تھا جو کائنات سے علیحدہ ہے دراصل زینوفینز کا نظریہ وحدۃ الوجود کے عقیدہ کا آئینہ بردار ہے نہ کہ وحید کا۔ زینوفینز کی نظر میں کائنات ہی خدا ہے۔

ہیراقلیطس (۴۷۵ - ۳۵۵ ق م) ایک امیر خاندان کا چشم و چراغ تھا اور جمہوریت سے متنفر تھا۔ اس نے نہ صرف ہومر اور ہسی آڈ کا حقارت سے ذکر کیا ہے بلکہ فیتاغورث اور زینوفینز کی بھی تحقیر کی ہے اور اس بات پر فخر کیا ہے کہ اُس کا کوئی استاد نہیں تھا اُس نے جو کچھ حاصل کیا خود حاصل کیا۔ اُس کا بنیادی نظریہ تغیر کا نظریہ ہے یعنی کائنات ہر آن اور ہر لمحہ تغیر پذیر ہے لہذا ہر چیز بھی اور نہیں بھی ہے، کوئی شخص کسی دریا میں حقیقتاً دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ دریا کا پانی تغیر کی وجہ سے دراصل وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس کا انداز بیان ابہام سے لبریز ہے اور اس ابہام سے گھبرا کر لوگ خود اسے مبہم کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے۔ اسی مبہم انداز بیان کی وجہ سے فلاسفہ یہ طے نہیں کر سکے کہ ہیراقلیطس کا تصور الہ دراصل کیا تھا؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مائطہ کے فلاسفہ مادیین کی طرح ہیراقلیطس بھی اصل کائنات ایک عنصر کو سمجھتا تھا جسے کبھی وہ نفس گرم کے نام سے یاد کرتا تھا اور کبھی آگ کے نام سے۔ ہیراقلیطس کے نزدیک ہر شے آگ سے پیدا ہوئی اور پھر آگ میں مل جائے گی۔ یہ آگ کسی دیوتا یا انسان کی پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ ازلی اور ابدی ہے۔ وجود اشیاء دو متضاد قوتوں کا رہین منت ہے۔ ایک قوت یا ہر آسمان سے آتی ہے اور آتش سیال کو مادے کی صورت میں بدلنا چاہتی ہے اور دوسری ہر زمین سے آسمان کی طرف جاتی ہے اور مادے کو آگ کے عنصر لطیف میں تبدیل کرنا چاہتی ہے، انھیں متضاد لہروں کی وجہ سے نباتات و حیوانات و ذوی العقول پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ٹرنڈرسل نے ہیراقلیطس کے جوتوال پیش کئے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ ہیراقلیطس دیوتاؤں کے علاوہ خدائے واحد کا بھی قائل تھا۔ جسے وہ آفاقی انسان کا مجسمہ سمجھتا تھا۔ اور پروفیسر اسٹیس نے ہیراقلیطس کے جوتوال پیش کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیراقلیطس دیوتاؤں کی پرستش پر اعتراض نہیں کرتا تھا بلکہ بتوں کی پرستش اور جانوروں کی قربانی پر معترض تھا۔ یعنی اگر تکلف یہ مان بھی لیا جائے کہ ہیراقلیطس خدا کو واحد کا قائل تھا تو وہ خدائے واحد کائنات سے ماورا کوئی ہستی نہیں بلکہ خود کائنات ہے۔

(باقی)

- "History of Philosophy Eastern & Western vol II p. 35 at
 "A Critical History of Greek Philosophy" p. 42 at
 "A History of Philosophy" By Thilly p. 32 at
 "History of Philosophy" By Weber pp. 18-19 at
 "History of Philosophy" By Thilly p. 33 at
 "A History of Western Philosophy" By Russell p. 63 at
 "A Critical History of Greek Philosophy" p. 79 at

کلام غالب کا طنزیہ پہلو

(فرمان فحیوری)

”ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اُن کو بجائے حیوان اطلق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے“

حالی نے سوانح غالب کے سلسلہ میں یہ بات کہی تھی اور شہوت میں خطوطِ غالب سے چند لطائف اور مزاحیہ اقتباسات بھی نقل کر دئے تھے اس کے بعد غالب کی شوخیِ بے حد کی وہ شہرت ہوئی کہ اُن کے تمام لطائف و مطائبات کو خطوط سے الگ کر کے مجموعہ کی شکل میں بار بار شائع کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کے خطوط ہی کو اُن کی شوخیِ تحریر کا مرکز سمجھ لیا گیا اور مدت تک اس امر پر غور نہ کیا گیا کہ جس شخص کو حیوانِ ظریف کہا جاسکتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس کی ظرافت کے آثار خطوط میں تو ہوں اور کلام میں نہ ہوں۔ غالباً ”آثارِ غالب“ کے مصنف نے پہلی بار کلامِ غالب کے نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ اُن کی ظرافت نگاری کا یہی جائزہ لیا اور اُس کے بعد غالب کے اسلوب پر جو کچھ لکھا گیا اُس میں اُس کی شوخی نگاری اور ظرافت کا ذکر ضرور کیا جانے لگا۔

لیکن محض شوخی و ظرافت جس پر آثارِ غالب کے مصنف اور دوسرے لکھنے والوں نے اتنا زور دیا ہے غالب کے طنزِ بیان کا طرہ امتیاز نہیں ہے بلکہ اُن کے اسلوب کے تیکھے پن میں طنزیہ لہجہ کا وہ بانگ بین ملتا ہے جس کا سودا اور انشا کی مزاح نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہے، غالب کی شوخیِ تحریر میں جو سنجیدگی اور ان کی سادگی میں جو ”پرکاری“ ہے وہ دوسروں کی سنجیدگی میں نہ ملے گی۔ ان کے ظریفانہ انداز بیان کا یہی ”تغافل“ بڑا ”جرات آزما“ ہے کہ اس میں مزاج کی وقتی کیفیت انگیزی نہیں بلکہ معنی خیز طنز کے دیر پا نشتر پنہاں ہوتے ہیں۔

یوں تو ظرافت و طنز کا مخرج ایک ہی ہے لیکن اپنے محل استعمال - غایت اور اثر کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نفسیاتی نقطہ نگاہ سے طنز و ظرافت ایک قسم کے احساسِ کمتری کے نتائج ہیں، یہ احساس کمتری بالعموم ماحول اور شخصیت میں عدم مطابقت کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے۔ انسان کی غیر آسودہ خواہشیں ذہن کے لاشعوری خانہ میں پناہ گزیں رہتی ہیں اور اپنی نا آسودگی کو چھپانے کے لئے اکثر احساسِ برتری کا روپ دھار لیتی ہیں، اور انسان میں ایک قسم کی کھوکھلی انانیت پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ سارا عمل لاشعوری ہوتا ہے اور انسان کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی لیکن دوسروں کے لئے ایسے شخص کے لاشعوری محرکات و عوامل کو سمجھ لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ جن لوگوں میں ماحول سے نہرِ آزار پہونے اور ماحول و شخصیت میں مطابقت پیدا کرنے کی قوت نہیں ہوتی وہ دوسروں پر بے سبب قہقہہ لگا کر اپنی کمزوریوں کو چھپائے رکھنے کی لاشعوری کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے ذہن بالعموم تقلیدی ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں تسخیرِ محض و خندہ ہائے بیجا کے سوا حقیقی ادبی طنز و ظرافت کی تلاش بے سود ہے۔ ہاں جو لوگ تخلیقی ذہن اور ماحول و شخصیت میں مطابقت پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ اپنے لاشعوری یا ذات سے آگاہ ہوتے ہیں اس قسم کے لوگوں کے احساس کمتری کے اظہار میں چونکہ خود آگاہی اور علی شعور کی کار فرمائی ہوتی ہے اس لئے اُن کے لب و لہجہ میں طنز اور طنز میں برکتی کے ساتھ ساتھ معنی خیز اثریت کا پیدا ہونا طبعی امر ہے۔ اردو میں غالب و اکبر اور انگریزی میں اڈلین و ڈرائیڈن، اسی قسم کے طنز نگار ہیں جو ذات و کائنات دونوں سے آگاہ ہیں۔ غالب کے طنزیہ لہجہ اور نوعیت کو سمجھنے کے لئے اُن کی شخصیت و ماحول کے تعلق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ غالب اگرچہ شکست خور وہ ماحول کی پیداوار تھے لیکن انھوں نے زمانہ سے کبھی شکست نہ مانی۔ وہ اپنی آرزو خیز طبیعت سے مجبور ہو کر کہتے تھے:-

”طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں“

ہر چند کہ اُن کی آرزو کا مطلب شکست آرزو سے زیادہ نہ تھا لیکن انھوں نے اپنی آرزوؤں میں کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ وہ عمر بھر نفس کو انجمن آرزو سے باہر کھینچے۔ پر عمل پیرا رہ کر ناکردہ گناہوں کی داد چاہتے رہے۔ اُن کی کوئی خواہش پوری ہوئی یا نہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ ہزاروں خواہشیں اپنے ساتھ لے کر گئے۔ خارجی طور پر وہ زمانہ کے ہاتھوں مجبور تھے۔ لیکن ذہنی شکست خوردگی کے لئے نہ وہ کبھی آمادہ ہوئے اور نہ ہی اُن کے حوصلوں اور حسرتوں میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی حسرتوں نے انھیں بار بار لیکن انھوں نے اپنی حسرتوں کو مارنے پر کبھی رضامند نہیں ہوئے۔ اُن کا دل حسرت زدہ آخر تک ایک ”مائدہ لذت درد ہنار با جس سے یار دل کا کام نکلتا رہا۔ غالب کی یہی غیر شکست خوردہ شخصیت اور اپنے ماحول سے مسلسل جنگ آزار رہنے والی ذہانت فکری طور پر انھیں اپنے پیش روؤں اور معاصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے اور ان کی یہ دلی دلی باغیانہ شخصیت جو ماحول کے قابو میں نہ آتی تھی اور جو نوال پذیر سیاسی و سماجی ماحول کے زیر اثر حسرتوں کا مجموعہ بن گئی تھی اُن کی ظرافت میں نہیں بلکہ طنزیہ لہجہ میں پوری طرح نمودار ہوتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ادب میں صرف طنز کا نہیں مزاح و ظرافت کا بھی اہم مقام ہے لیکن چونکہ مزاح و ظرافت میں بجز ہنسنے ہنسانے کے اصلاح و تعمیر حیات کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس لئے ذہنی عیش کوشی اور وقتی خوش طبعی کے سوا اس کا اور کوئی حاصل نہیں۔ مزاح یا ظرافت سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ سطحی اشعار میں بھی ایک طرح کا چہلپہلپ آجاتا ہے جو شعر میں وقتی اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اس قسم کی شوخی و ظرافت ہر طباع و ذہن شاعر کے یہاں لے گی چنانچہ غالب کے دیوان میں بھی اس قسم کے ظرافت آمیز اشعار ملتے ہیں۔ جن میں مزاح برائے مزاح کے سوا کوئی مقصد نظر نہیں آتی۔ ذیل کے چند اشعار اسی قبیل کے ہیں۔ جن میں زیادہ تر لفظی شہدہ بازی اور بات میں بات پہنچانے کی بے مقصد کوشش کی گئی ہے:-

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن، دل کے پہلے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں، رنگ لائی گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
پنیں پہ گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے، کاندھا بھی کہا رول کو بدلنے نہیں دیتے
دھول دھپا اس سراپا کا شہوہ نہیں، ہم بھی کر مٹی تھے غالب پیش دستی ایک دن
ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس بلوغتوں کا، وہ اک گندستہ ہے ہم بخودوں کے طاقبتاں کا

غالب کے یہاں اس قسم کے اشعار کم ہیں ہاں اُن کے طنزیہ لہجہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھیں محض شوخ نگار نہیں بلکہ اردو کا پہلا طنز نگار سمجھنا چاہئے وہ انشاء اور سودا کی طرح محفل میں صرف ہمہ بھی پیدا کرنے یا تبحر علمی کا رعب جمانے کے لئے کسی پر قہقہہ نہیں لگاتے بلکہ سنجیدگی سے مسکراتے کے قابل ہیں۔ اور اُن کی اس سنجیدہ مسکراہٹ میں زندگی کی تعمیر و اصلاح کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور موجود ہوگا۔ پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ:-

”سماجی یا اخلاقی اصلاح کی پشت پناہی کے بغیر طنز طنز نہیں رہ سکتا۔ فرد کی سماجی حیثیت کو طنز کا موضوع ہونا چاہئے۔۔۔

اگر طنز میں فراخ دلی۔ وسیع القلبی اور انسانی ہمدردی کے عناصر نظر نہ آئیں گے تو طنز اعلیٰ ادب نہیں بن سکتا۔“

چونکہ غالب کے وقت میں بیسویں صدی کی طرح کسی قسم کی سماجی یا اخلاقی اصلاح کی تحریک رونما نہ ہوئی تھی اس لئے اُن کے طنز میں کسی منظم و متعین اصلاحی پہلو کی تلاش اُن کے ساتھ زیادتی ہو۔ جس طرح اُن کی مجموعی شاعری کا بظاہر کوئی مقصد نہیں اور ہزاروں مقصد ہیں۔ بالکل اسی طرح اُن کے طنز میں بھی کوئی اصلاحی تحریک نہیں۔ درحقیقت تحریکیں ہیں۔ اور چونکہ وسیع القلبی، فراخ دلی اور انسانی ہمدردی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے اُن کے طنز میں اعلیٰ درجہ کی ادبیت کا آجانا ضروری تھا۔

موضوعات کے اعتبار سے غالب کے طنز میں غیر معمولی تنوع اور وسعت ہے۔ اُن کی مجموعی شاعری کی طرح اُن کے طنز میں ہجہ میں بھی ہمہ گیری ہے۔ شیخ۔ واعظ۔ ناسخ۔ دنیا۔ عقبی۔ دوزخ۔ جنت۔ پیر۔ پیغمبر۔ عرش۔ فرش۔ خدا۔ فرشتہ۔ شاعر۔ ادیب۔ شاہ۔

مزدور - عاشق - معشوق - صوفی - تجذوب - دوست - دشمن سب کو انھوں نے کسی نہ کسی انداز سے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ان کے انداز بیان کی دلکشی و لطافت کا یہ عالم ہے کہ کسی بے محل موثر گافی - بے مقصد طعن و تشنیع - بے جا تشدد - یا محض زباں درازی کا گمان تک نہیں ہوتا۔ اُن کے طنز کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تیریم کش ہی رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو قمیڑی طنز کی غایت بھی یہی ہے کہ وہ ایک ایسی دائمی خلش کا سامان فراہم کرے۔ جس کی کسک عمر بھر محسوس ہوتی رہے۔ غالب طنز نگاری میں استدلال - جرئتگی اور احساس زندگی اور باحوئی اثرات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے طنز و نشر بالعموم روزمرہ کی زندگی کے واقعات کی مدد سے طیار کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں طنز میں مشاہدہ اور تجربہ کے واقعاتی عناصر اس طور پر چھپائے رہتے ہیں کہ کہیں بھی محض تصوریت یا ماورائیت کا اثر نہیں آتا۔ مثلاً غالب کو یہ بات اُن کے باحول اور تجربہ نے سکھائی کہ کسی واقعہ کی صداقت کے لئے ثبوت اور شہادت کی بھی ضرورت ہوتی ہے برہان قاطع کے سلسلہ میں وہ توہین عدالت کا مقدمہ لڑ چکے ہیں اور نمپشن کے معاملہ میں عدالتی کارروائیوں سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ ان عدالتی تجربات نے اُن پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ کسی واقعہ کو ثابت کرنے کے لئے ثبوت و شہادت کے ساتھ فریقین کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ کوئی دعویٰ یا بیان جو فریق ثانی کے عدم موجودگی میں طیار کیا گیا ہو اور جس میں ملزم کو عذر اور صفائی کا موقع نہ دیا گیا ہو عدالت کی نظر میں بے معنی ہے۔ اس باحول اور واقعاتی صداقت کے سبب اثر جب غالب انسانی اعمال - یوم حساب - روز سزا و جزا - کاتبین اعمال اور مذہبی معتقدات پر غور کرتے ہیں اور کیسے لطیف استدلال کے ساتھ عدالت ازلی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

پکڑتے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناقص آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا ؟
اسی طرح انھیں انسان کے اشرف و محمود ہونے پر یقین ہے۔ اس کی آفرینش کی روشن غایت اور اختیار و اہتمام کی بھی خبر ہے۔ اسکے بعد انسان کی اخلاقی لپٹی اور معاشی ناہمواری اور سماجی ذلت جس انتہا کو پہنچ گئی ہے وہ بھی اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ جب بنی نوع انسان کی اس بلندی و اُپتی کے اسباب ان کی سمجھ میں نہیں آتے تو وہ تعظیم و تحقیر کے اس ناہموار نظم و ضبط پر کیسے مدلل اور استفسار یہ لہجہ سے چوٹ کرتے ہیں۔

میں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی اپنند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
ایک فارسی شعر میں بھی اسی قسم کا مضمون ادا کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ: آج جو مجھے کسی طرح قبول نہیں کر رہا اس کو ”ظہور حسن“ سے پہلے
کا ”شیوہ احترام“ یاد دلانا چاہئے۔

اے آنکہ از غرور بہیم غمی خسری زان شیوہ بازگوئے کہ پیش از ظہور بود
انھیں عیسیٰ کے اُس معجزہ کی بھی خبر ہے کہ وہ مردہ کو زندہ کر دیتے ہیں۔ اُن کی میحاثی سے بیماروں کو شفا ملتی ہے۔ لیکن غالب جس بیمارِ دل کا شکار ہیں۔ اُس نے اُن کے قویٰ مضحک کر دئے ہیں۔ عناصر سے اعتدال ختم ہو گیا ہے۔ کسی کا کوئی زور نہیں چلتا۔ نہ لگائے بنتی ہے نہ بچھائے کیس کا کوئی اعجاز کام نہیں آتا ہے۔ اس لئے وہ حضرت عیسیٰ کی میحاثی کو کیسے استغنائی انداز سے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی مرے دل کی دعا کرے کوئی

مومن نے بھی حضرت عیسیٰ کا ذکر بڑے اچھوتے انداز سے کیا ہے۔

منت حضرت عیسیٰ د آٹھائیں گے کبھی زندگی کے لئے شرمندہ و حسان ہوں گے

لیکن یہاں صرف زندگی کے بے حقیقت ہونے کا اظہار ہے اور طنز کا کوئی پہلو نہیں نکلتا اور غالب کا لہجہ سراسر طنزیہ ہے۔

حضرت موسیٰ پر اکثر شعراء نے طنز کیا ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم اک شعلہ برق خرمین صد کوہ طور تھا

تیسرا یہ لہجہ طنزیہ سیدھا سادہ اور محض بیانیہ ہے اُن کے یہاں برہان کے پس منظر میں ایسی کوئی بات مقدر نہیں جو کسی قرینہ سے سامنے

آجائے یا جس کے احساس سے طنز کی تلخی بڑھ جائے۔ غالب اس طرح براہ راست حملہ کرنے کے قائل نہیں۔ وہ اس راز کو سمجھتے ہیں کہ طنز کا نشتر کئی اوقات انداز ہی میں زیادہ کارگر ہوتا ہے اس لئے وہ موسیٰ پر طنز کا ایسا طرز اختیار کرتے ہیں گویا موسیٰ سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔
گرنی تھی ہم پہ برقی تہلی - نہ طور پر دیتے ہیں بادہ طوفان قدح خوار دیکھ کر
ایک فارسی شعر میں یہ کہہ کر کہ ”شعلہ طور“ کی بجگہ ”سنگ و گیاہ“ میں نہیں بلکہ دل میں ہے حضرت موسیٰ و جلوہ طور دونوں کو طنز کا ہدف بناتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

چرا بہ سنگ و گیاہ میچی اسے زبانی طور ،
اقبال نے اسی خیال کو اردو میں اس طرح بیان کیا ہے :-

”تاب کے طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم
اپنے سینے سے عیاں آتش سینائی کر
غالب نے اردو کے ایک اور شعر میں بڑے حوصلہ مندانہ اور بے نیازانہ انداز سے حضرت موسیٰ کی ناکامی پر طنز کیا ہے۔
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی ،

غالب کے طنز کا کمال یہ ہے کہ وہ براہ راست کسی کو طنز کا ہدف نہیں بناتے۔ عام واقعات کے بیان میں صرف اسلوب کی مدد سے خص صطنز کا لہجہ پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت یوسف کے متعلق دوسرے شعرا کی طرح یہ کبھی نہیں کہتے کہ اُن کے محبوب کے حسن و جمال کے آگے یوسف کا حق جہاں بے وقعت ہے۔ نظا ہر ہے کہ اس خطیبانہ انداز بیان میں طنز کی داکشی کہاں۔ اس لئے وہ منہ سے بہت کم کچھ کہتے ہیں۔ صرف لب و لہجہ سے شعر میں طنز کے نشتر توڑتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر گھر جاتا تو میں لائق تعزیر بھی ہوتا

یوسف ہی نہیں بلکہ زلیخا پر بھی غالب نے بالکل اچھوتے انداز میں طنز کیا ہے۔ محبوب کی محبت میں غالب کا یہ عالم ہے کہ انہیں آپ اپنے پر شریک آجانا ہے اور محبوب کو دیکھا دیکھ نہیں جاتا۔ اس کے برعکس جب وہ زلیخا کے اس واقعہ کو سنتے ہیں کہ اس نے زمان مصر کو جمع کر کے اپنے محبوب یوسف کا جلوہ دکھایا تو وہ اسے ”رسوائی حسن“ خیال کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

سب قیہوں سے ہوں ناخوش۔ پر زمان سرست
ہے زلیخا خوش کہ مجھ ماہ کنساں ہو گئیں

حضرت خضر بھڑے بھشکوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اُن کی عمر جاودانی ہے۔ وہ روز آفرینش سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے باوجود وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ لیکن غالب کے نزدیک تو زندگی زندہ دلی نمود۔ ظہور اور روشناسی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ جب وہ زندگی کی یہ علامتیں خضر کی حیات جاودانی میں نہیں پاتے تو وہ بڑے حیات خیز و تند و تیز انداز میں خضر کی عمر جاودانی پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق نے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
اس شعر میں چور بننے کا ٹکڑا جس قدر حسین و لطیف ہے اس کی مثال اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔
دوسری جگہ کہتے ہیں۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنا کرک کوئی

حضرت ابراہیم کے کارنامے ایسے حیات آفرین ہیں کہ اُن پر طنز کرنے کی کوئی سورت نہیں ہے۔ فارسی اور اردو کے اکثر شعرا نے حضرت ابراہیم کی حوصلہ مندی سے متقل مزاجی اور حق پرستی کو سراہا ہے۔ حضرت ابراہیم کا واقعہ آج بھی آگ میں پھول کھلانے اور غرور ویت کو خاک میں ملانے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے غرور دہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصد دہے

لیکن غالب کی اختراع پسند طبیعت نے حضرت ابراہیم پر طنز کرنے کا ایک پہلو نکال ہی لیا۔ فارسی کے ایک شعر میں انھوں نے صرف لہجہ کی مدد سے

حضرت ابراہیم پر ایسا لطیف و کارگر طنز کا وار کیا ہے کہ اردو اور فارسی کی ساری عشقیہ شاعری میں اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ غالب کہتے ہیں ایک میں ہوں کہ اپنی آگ میں آپ بلا کسی شرم و شعلہ کے جلا جا رہا ہوں اور ایک حضرت ابراہیم ہیں کہ آگ میں ڈالے گئے اور نہ جلے۔

شنیدہ کہ ذاتش نہ سوخت ابراہیم ہمیں کہ بے شرم و شعلہ می توانم سوخت

کلام غالب میں اس طنزیہ لہجہ کی تلاش سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا مجموعی انداز ہی طنزیہ ہے۔ ان کی خود پسندی اور جدت طراز طبیعت ہر چیز میں کوئی نہ کوئی خامی تلاش کر لیتی ہے۔ اور اس پر ایسے فنکارانہ انداز سے طنز کرتی ہے کہ بوٹ کھا کر بھی مسکراتے ہی بنتی ہے۔ ابراہیم کی طرح منشو جیسے انانی صوفی کو بھی طنز کا نشانہ بنانا آسان نہیں۔ خود غالب نے کنایتاً انھیں سراہا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
اگرچہ یہاں بھی ”دل ہر قطرہ“ کو ”سازِ انا البحر“ کہہ کر تعلق کا پہلو نکال لیا ہے لیکن دوسری جگہ تو انھوں نے منصور کے کردار میں ہی ایک ایسا کمزور پہلو ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور ایسا زبردست وار کیا ہے کہ منصور کی ساری انانیت متزلزل نظر آتی ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں

عشق کی دنیا میں فریاد کا نام بھی ہمیشہ ستودہ رہا ہے اور اکثر شعراء نے میدانِ عشق میں اپنے کو فریاد کا ہم سیر قرار دے کر تعلق کا اظہار کیا ہے۔ عشق میں محبوب کی رضا جوئی اور جباں سپاری کی جو مثال فریاد نے قائم کی ہے وہ فی الواقع اہل دل کو منزلِ عشق میں تسلیم و رضا و استقلال کا سبق دیتی ہے۔ لیکن غالب کے طنز سے وہ بھی نہیں بچ سکا۔ اور غالب نے فریاد کی جن کمزوریوں کی طرف اشارے کئے ہیں انھیں سماجی اور اخلاقی زندگی کی نگ و دو میں نا ستودہ ہی شمار کرنا چاہیے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن است سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود کھتا

واعظ۔ شیخ اور ناصح پر ہماری شاعری میں اس قدر چوٹیں کی گئی ہیں کہ یہ موضوع بالکل پامال ہو گیا ہے۔ مضمون کی تکرار خیال کے اعادہ اور بے معنی سطحی تعلق کے علاوہ اب کوئی ایسا پہلو باقی نہیں رہا جو ادبی طنز و طعن کا جزو بن سکے۔ غالب نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اس لئے کہ انھیں روش عام اور تقلید سے سخت نفرت تھی۔ دوسرے یہ کہ ان میں خود داری۔ خود پسندی۔ اور اپنی برگزیدگی و برتری کا احساس اس قدر تھا کہ وہ ایسی چھوٹی موٹی شخصیتوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ پورے دیوان میں چند اشعار اس موضوع پر ملیں گے۔ اور ان میں بھی ایسا لطیف طنز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ اس پامال موضوع میں بھی ایک قسم کا نیا پن اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ چند شعر دیکھئے۔

کہاں ہے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پراتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا ہم نکلے

واعظ نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھاری شرابِ ظہور کی

شورِ پند ناصح نے زخم پر نیک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو مے و نغمہ کو یہ اندوہ رہا کہتے ہیں

حضرت ناصح کر آئیں دیدہ و دل افروز راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو وہ سمجھا میں گے کیا

ایک فارسی شعر میں حضرت ناصح کے طنزِ خطاب پر وار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ناصح اپنے پند و وعظ میں جس شخص کا بار بار ذکر کرتا ہے اس پر جان فدا کر دینے کے لائق ہے لیکن ناصح میں وہ لطافتِ ذوق کہاں جو اس پر ہی دش کے بیان کے لئے ضروری ہے۔

رواں فدائے تو نام کہ ہمدہ ناصح زہے لطافتِ ذوق کہ در بیان تو نیست

ادھر حضرت عیسیٰ۔ موسیٰ۔ یونس۔ ابراہیم۔ منصور۔ فریاد۔ واعظ و ناصح پر طنز کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے سماج کو نہیں بلکہ فرد کو نشانہ بنایا ہے اور اس طرح ان کے طنز کا دائرہ محدود ناقص ہو گیا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے مذہبی عقاید۔ معاشرتی روایات اور سماجی رجحانات کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ جن افراد پر غالب نے چوٹیں کیں ان میں سے ہر ایک کے پیچھے سماج کا

ایک بڑا گروہ ہے۔ اور ان افراد پر طنز دراصل سماجی گروہ پر طنز ہے۔ اس طرح غالب کا طنزیہ لہجہ فرد پر نہیں بلکہ پوری سوسائٹی پر وار کرتا ہے۔ زمانے کی شکایت سے بھی آرد و فارسی کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ غالب نے بھی ان کا جا بجا ذکر کیا ہے لیکن ایک شعر میں انہوں نے ایسے متضاد انداز بیان کی مدد سے زمانہ کی سخت آزادانہ فطرت کا ذکر کیا ہے کہ طنزیہ اسلوب کی چابکدستی پر حیرت ہوتی ہے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد و گرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

غالب نے اپنے معاصرین خصوصاً استاد شہ پر بھی چوٹیں کی ہیں۔ بہادر بخت کے سہرے میں اُن کا یہ مقطع ہے

”ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکڑ سہرا“

تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس معمولی سی شاعرانہ تعلق پر جو اس وقت تمام شعراء میں عام تھی غالب کو گزارش احوال واقعی کے طور پر معذرت

کرنی پڑی۔

اس ”سخن گسترانہ“ بات سے قطع محبت مقصود رہی ہو یا نہ رہی ہو لیکن اس بات کو واضح کرتی ہے کہ غالب کی طنزیہ طبیعت شاہ اور استاد شاہ دونوں پر چوٹ کرنے سے باز نہ رہتی تھی۔ ذیل کے مقطع میں بھی غالب نے استاد شہ پر ذومعنویت کے پردے میں بڑا لطیف طنز کیا ہے۔

ہنا ہے شہ کا مصاحب بھرے ہے اثر اتنا و گرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اس شعر میں ”استاد شہ سے پرخاش“ کا گمان ہوا۔ شاہ نے بلا کر باز پرس کی لیکن طنزیہ بیان کچھ ایسا تھا کہ غالب قانونی گرفت میں نہ آ سکے۔

غالب کے قطعہ کے چند اشعار دیکھیے جس میں بظاہر بہادر شاہ ظفر کی مسخ کی گئی ہے۔

اے شہنشاہ آسمان و رنگ اب جہاں آفتاب آثار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمی بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز رو شناس تو ایت و ستار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ذوق آرایش سرو دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہے آخر تانہ دے باد زہر یہ آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش جسم رکھتا ہوں ست اگرچہ نزار

کچھ خریدتا نہیں ہے اب کے سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار

مری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجا ر

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پر مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقبر حیات اور چھ ماہی جو سال میں دوبار

بس کہ لیتا ہوں ہر چھینے خرمن اور رہتی ہے سود کی تکرار

آپ کا بندہ اور پھر سے ننگا آپ کا نوکر اور کھانڈاں ادھار

مری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ تانہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

لوگ اسے مدح کہتے ہیں میں کہتا ہوں کیا انگریزوں کے پیش خوار مغنیہ شاہنشاہوں کی ہے کسی۔ دہلی کے آخری حکمران کی برائے نام شہنشاہیت۔ کھوکھلے اقتدار۔ زوال پذیر مارت اور بے نظم و ضبط طرز حکومت پر اس سے بہتر طور پر طنز ممکن تھا۔ ان اشعارت بادشاہ کے جلال کا نہیں بلکہ زوال کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ اب اسے آپ مدح کہیں گے یا طنز۔

نامہ بر کو بھی غالب نے نہیں چھوڑا۔ لکھتے ہیں ۷

تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر نے
”سلام کہیو“ کے ٹکڑے نے طنز کے لہجہ میں عجیب زور اور لطف پیدا کر دیا ہے۔

بہشت کی بے کیفی کا اکثر شعراء نے اظہار کیا ہے۔ غالب کا تو یہ خاص موضوع ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو شاعری دونوں میں
بہشت کا خاکہ طرح طرح سے اڑایا ہے۔ بعض جگہ محض شوخی و ظرافت اور بعض جگہ طنز۔ طنز لہجہ میں وہ بہشت کی جملہ بے کیفیتوں کا اظہار
نہیں کرتے بلکہ صرف ایک دو الفاظ یا لب و لہجہ کی مدد سے لطف پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً داروغہ بہشت پر وہ اس طرح طنز کرتے ہیں :-

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی خلد میں گھر جو ترا یاد آیا

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہیں

غالب نے اپنی فارسی شاعری ”ابر گہریار“ میں بھی جنت کی بے کیفیتوں کا ذکر بڑے انداز میں کیا ہے۔ یہ شاعری اپنے حسن و بلاغت کے لئے
اس قدر مشہور ہے کہ اس کا اقتباس دیگر مضمون کو طول دینا مناسب نہیں۔ صرف فارسی غزل کا ایک شعر دیکھئے۔ اس میں جنت کی تعمیر کا خاکہ
کس بلاغت سے اڑایا گیا ہے ۷

جنت چہ کند چارہ افسردگی دل تعمیر بہ اندازہ دیرانی مانیت

غالب اپنے محبوب پر بھی لعن طعن کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کے یہاں ”واسوخت“ یا ”ریختی“ کے طرز پر بزدلانہ گریہ و آزاری یا
شکوہ طرازی نہیں بلکہ ان کے یہاں رند شاہد باز کی مخلصانہ جسارت ہے۔ چند اشعار دیکھئے ۷

یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جسکے دشمن اُس کا آسمان کیوں ہو

آئینہ دیکھ کر اپنا سامنہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور رکھتا

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ہٹنے میں رسوائی بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو پھر کہتے کہ ہاں کیوں ہو

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی فتنہ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

نوبہ امن ہے بیدار دوست جاں کے لئے رہی نہ طرز ستم کوئی آسمان کے لئے

تم شہر میں ہو تو ہمیں کہا غم جب اٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

حتیٰ کہ جب غالب کو غیر خود پر طنز کرنے کا موقع پاتے ہیں آتا تو وہ خود پر یہ کہہ کر مسکراتے لگتے ہیں ۷

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھنا چاہئے

غرض غالب کے اسلوب کے تکیے پن میں طنز لہجہ کو خاص دخل ہے۔ مزاح کہیں کہیں ہے اور طنز جگہ جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
ظرافت نے ان کی انانیت سے دو چار ہو کر ایک ہمہ گیر طنز کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ بقول شیخ محمد اکرام وہ کائنات کی ہر چیز کی منہسی اس طرح
اڑاتے ہیں جیسے کائنات کے ہر ناداں و دانا کے راز سے آشنا اور کمزوریوں سے واقف ہیں۔

خود ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں ۷

راز دارِ خوئے آدم کردہ اند

خندہ بر ناداں و دانا می زخم

دُمدار سیارے اور واہمہ پرستی

یونٹو جہ سہا میں جو چیز نظر آتی ہے حیرت افزا ہے، لیکن روز روز کے دیکھنے سے اس کی قدرت زایل ہو جاتی ہے، ہر صبح ایک کرۂ آتشیں کا افق شرق سے نمودار ہو کر بینائیوں کو خیرہ کر دینا، ایک شانہ شوکت و جبروت کے ساتھ ساعت بہ ساعت اس کا بند ہو کر پھر شام کو افق مغرب میں سر چھپا لینا، اسی طرح طلوع قر، اس کا عروج و زوال اور دوسرے سیاروں کا طلوع و غروب، یہ سب ایسے مناظر ہیں کہ عام فطرت میں ان کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی اور باوجود اسباب و کیفیات کے علم کے بھی ان کی حیرت انگیزیاں بدستور قائم رہتی ہیں، لیکن چونکہ ہماری آنکھیں ان کے دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ اس لئے ہم ان پر نہ غور و فکر کرتے ہیں اور نہ محل تعجب قرار دیتے ہیں برخلاف اس کے چونکہ کسوف و خسوف کا ظہور کم ہوتا ہے اس لئے ہم ان کو دیکھ کر ایک قسم کا خوف و قلق محسوس کرتے ہیں اور دُمدار سیارے اتفاق سے کبھی نظر آتے ہیں اس لئے ان کا اثر اور زیادہ قوی ہوتا ہے اور ان کے ظہور کو عام طور پر کسی مصیبت کا پیش خیمہ خیال کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض واہمہ پرستی ہے۔

سب سے پہلے جس نے دُمدار سیاروں کا ذکر کیا ہے وہ یونان کا فلسفی دیموقریطس ہے جو قبل مسیح پانچویں صدی میں پایا جاتا تھا۔ اس نے بیان کیا کہ دُمدار سیارہ نتیجہ ہے دو سیاروں کے اقتران (اجتماع) کا۔

ارسطو نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ سیاروں کے اقتران کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ نتیجہ ہے ان اجزاء کا جو زمین سے اٹھ کر بلند ہوتے ہیں، اس کے بعد مینکارو مانی حکیم نے (جو قبل مسیح تقریباً ایک صدی قبل پیدا ہوا تھا) علم و حکمت کے نقطہ نظر سے بحث کی اور ان میں سے کسی نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ دُمدار سیاروں کا طلوع کسی آنے والی بلا کا پیش خیمہ ہے۔

قدیم اقوام میں صرف اہل چین کی تاریخ میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لیکن انھوں نے بھی صرف ان کے طلوع و غروب اور اوہام پرستی موافق ظہور سے بحث کی ہے اور کہیں یہ نہیں پایا جاتا کہ وہ انھیں فال بد سمجھتے تھے، اس کی ابتداء فلسطین سے ہوئی کیونکہ یہ وہ خیال کرتے تھے کہ یہ خدا کے قہر و غضب کی تلوار ہے، جس سے فرشتے شریعہ لوگوں کو ہلاک کریں گے، رفتہ رفتہ یہ خیال بڑھتا گیا اور قرون وسطیٰ میں وہ حد درجہ مستحکم ہو گیا، چنانچہ ابوتامام ایک جگہ لکھتا ہے:-

و خوف الناس من وہبیا مظلمة لما بدأ لکوکب الغربی ذو ذنب

(یعنی جب مغرب کی طرف سے طلوع ہونے والا دُمدار سیارہ ظاہر ہو، تو لوگوں کو آنے والی تباہیوں سے ڈرے گا)

ابن اثیر نے ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) کے حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ اسی سال قبلہ کے بائیں سمت سے ایک سیارہ نمودار ہوا جو برابر چالیس راتوں تک دیکھا گیا، یہ بہت طویل اور دُمدار تھا۔ اس کو دیکھ کر لوگوں میں بہت خوف پیدا ہوا۔ اہل یورپ پر اس سیارہ کا جو اثر ہوا اس کا بیان خود لوئیس اول (شاہ فرانس) کے رئیس انجمن کی زبان سے سنئے وہ بیان کرتا ہے کہ:-

”جب بادشاہ کو اس سیارہ کے طلوع کی خبر معلوم ہوئی تو وہ سخت مضطرب ہوا اور تمام علماء دربار کو جن میں میں بھی شامل تھا طلب کر کے درمات کیا کہ اس سیارہ کے طلوع کا کیا مطلب ہے اور یہ کس مصیبت کی خبر دیتا ہے۔ میں نے عرض کی کہ کل تک کی جہالت عطا ہو۔ اس نے کہا میں جانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ ایک بادشاہ کی موت اور دوسرے کی

تخت نشینی ہے، تم مجھ سے اس خبر کو چھپانا چاہتے ہو، اسی وقت محل کی چھت پر جاؤ اور سارا حال دریافت کر کے مجھے آگاہ کرو،
جب تمام منجموں نے دیکھا کہ بادشاہ کے دل سے یہ خیال نہیں نکل سکتا تو سب نے متفقہ طور پر کہہ دیا کہ اس کا ظہور کثرتِ معاصی
کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اپنے اخلاق کی درستی کی طرف مایل ہو گیا اور متعدد گرجے تعمیر کرائے۔
چونکہ مشکل سے کوئی سال ایسا گزرتا ہے کہ قحط، وباء یا جنگ کی تباہ کاریاں نہ دیکھی جاتی ہوں، اس لئے جب کسی ایسے ہی سال میں دُمدار
ستارہ نے طلوع کیا تو تمام مصائب کا ذمہ دار اسی کو قرار دیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ وہم لوگوں کے دلوں میں نہایت استحکام کے ساتھ قائم ہوتا گیا، حالانکہ معاصی
کی سزا کا تعلق اس سے کچھ نہیں ہے۔

پہلی دُمدار سیارہ جو ۱۹۱۷ء میں طلوع ہوا تھا، دورہ کرنے والے سیاروں میں سے ہے اور ہر ۷۷ سال کے بعد نظر
آتا ہے۔ جب ۱۹۶۶ء میں اس کا طلوع ہوا تو اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب ولیم نے انگلستان فتح کیا تھا۔
اس لئے اہل انگلستان نے اپنے مصائب کی علت اسی کو قرار دیا، ابن اثیر بھی اسی سیارہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "۱۰۶۶ء (۱۰۶۶ھ)
میں ارجادی الاول ایک بڑا ستارہ مشرق کی طرف رونما ہوا جس کی دم بہت طویل تھی اور وسط آسمان تک پہنچی گئی تھی۔ یہ ستارہ، ارجادی الاول
تک نظر آیا اور پھر غائب ہو کر غروب آفتاب کے وقت اس مہینہ کے آخر میں دکھائی دیا، رات ہو جانے پر جنوب کی طرف اس کی دم پھیلی ہوئی نظر
آنے لگی اور اس طرح دس دن تک برابر نظر آیا۔ اس واقعہ نے لوگوں میں سخت اضطراب پیدا کر دیا تھا۔"
اس بیان سے ظاہر ہے کہ یہ سیارہ جس وقت پہلے نظر آیا آفتاب کے قریب تھا، اس لئے افق شرقی میں غروب آفتاب کے بعد دکھائی دیتا
تھا۔ جب اور قریب ہو گیا تو آفتاب کے ساتھ ہی نظر آنے لگا اور اسی کے ساتھ غائب ہو گیا۔ اس کے بعد جب دوسری جہت میں اس سے دور
ہو گیا تو پھر غروب آفتاب کے بعد نظر آنے لگا۔

یہی سیارہ جب ۱۸۷۶ء (۱۲۵۶ھ) میں ظاہر ہوا تو اس نے شرقاً غرباً طلوع کیا تھا اور اس وقت اس کے طلوع کو بہت اہمیت دی گئی
تھی کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب قسطنطنیہ حال ہی میں فتح ہوا تھا اور سلطان محمد ثانی کی فتوحات کا غلغلہ یورپ میں بلند ہو رہا تھا، ابن ایاس نے
اس کے ظہور کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ: "۱۸۷۶ء کے وسط جادی الاولیٰ میں ایک طویل قُصودار سیارہ ظاہر ہوا جو مشرق کی طرف طلوع
کرتا تھا۔ یہ برابر دو مہینے تک نظر آیا اس کے بعد ہی مصر میں طاعون آیا اور آگ لگ گئی۔ مورفین یورپ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح
کے اوبام پیدا کئے ہیں۔

گردش کے اصول بات دراصل یہ ہے کہ نظام شمسی کے تمام سیارے، آفتاب کے گرد ایک متعین خط پر گردش کیا کرتے ہیں اور اسی
دائرہ کو فلک کہتے ہیں۔ پھر چونکہ دُمدار سیارے بھی نظام شمسی سے وابستہ ہیں اس لئے یہ بھی آفتاب کے گرد پھر کرتے
ہیں لیکن بعض ان میں سے ایسے ہیں جو آفتاب سے بہت قریب رہ کر گردش کرتے ہیں اور بعض بہت وسیع دائرہ بناتے ہیں۔ مثلاً انکی دُمدار سیارہ
آفتاب سے بہت قریب رہ کر اپنا دائرہ قائم کرتا ہے اس لئے وہ ہر ۳ ۱/۲ سال کے بعد نظر آجاتا ہے، پہلی اس سے زیادہ وسیع دائرہ بناتا
ہے اور ۷۷ سال کے بعد دکھائی دیتا ہے، بعض وسعت فضاء میں اس قدر دور نکل جاتے ہیں کہ ہزاروں سال کے بعد اپنی صورت دکھاتے
ہیں چنانچہ وہ سیارہ جو ۱۸۱۷ء میں رونما ہوا تھا اس کی مدت گردش تین ہزار سال سے زائد ہے۔

تعداد اور دیگر خصوصیات اس وقت تک جتنے دُمدار سیارے دور بینوں کے ذریعہ سے دیکھے گئے ہیں ان کی تعداد کم از کم چار سو
ہے اور یہ سب کے سب نظام شمسی سے وابستہ ہیں، ان کے حجم کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے:۔

۱۔ سر قلب (سرے کا درمیانی حصہ) جسے انگریزی میں (nucleus) (عربی میں نواة کہتے ہیں) اور دم۔ بعض
کے سرے چھوٹے ہوتے ہیں اور بعض کے بڑے، بعض کے قلب نہیں ہوتا، اور بعض کی دم طویل نہیں ہوتی بلکہ سر کے قریب ہی پھیلی
ہوئی نظر آتی ہے۔

- (۱) یہ ستارہ جس قدر آفتاب سے قریب ہوتا جاتا ہے اس کا سر چھوٹا ہوتا جاتا ہے اور دُم طویل ہوتی جاتی ہے، اس کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اس کا سر ہمیشہ آفتاب کی طرف ہوتا ہے اور دُم اس کے دوسری جانب۔
- (۲) اس کا مادہ سطح زمین کی ہوا سے ہزار گنا زیادہ لطیف ہوتا ہے اور اس لئے اس کے اندر سے چھوٹے چھوٹے مارے بھی نظر آتے ہیں دُمدار ستاروں کے افلاک یا دائرے مقرر نہیں ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً جذب سیارات کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں۔
- (۳) ان کے سرے جب گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ جاتے ہیں تو اس کے اجزا منتشر ہو کر آفتاب میں منجذب ہو جاتے ہیں یا دوسرے ستاروں میں۔

(۴) ان کی دُم بدلتی رہتی ہے۔ یعنی جو دُم کل نظر آتی تھی وہ اور تھی، جو کج نظر آتی ہے وہ دوسری ہے۔

ان کی عمومی تقسیم دو قسموں میں کی جاتی ہے، ایک قسم تو ان ستاروں کی ہے جو ایک جہت میں گردش کرتے ہیں اور ایک کے بعد تقسیم دوسرا اس کے نقش قدم پر روانہ ہوتا ہے، اس قبیل کے ستارے وہ ہیں جو ۱۶۶۸ء - ۱۸۴۳ء - ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۶ء میں ظاہر ہوئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سب ایک ہی اجزاء کے مختلف ستارے تھے، اس لئے ان سب کا دائرہ گردش ایک ہی تھا، دوسری قسم ان دُمدار ستاروں کی ہے جن کو دوسرے ستاروں نے فضا سے کھینچ کر طواف شمسی پر مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے دُمدار ستارے جنہیں مشتری نے اپنا قیدی بنالیا ہے ۳۰ ہیں۔ زحل کے جذب کئے ہوئے دو، ارنوس کے تین اور نیپٹون کے چھ ہیں، وہ ستارے جو آفتاب سے زیادہ قریب ہیں اگر کسی دُمدار ستارے کو اپنا قیدی بناتے بھی ہیں تو آفتاب جہیں لیتا ہے اور صرف اپنے دائرہ جذب سے کام لے کر انہیں طواف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

وہ دُمدار ستارے جو بیضاوی (Elongation) دائرے بناتے ہیں اور ایک متعین مدت کے اندر اپنے دورہ کو ختم کر دیتے ہیں۔ تعداد میں ۱۸ ہیں۔ جن میں سب سے چھوٹا دائرہ بنانے والا انکی ہے اور بڑا دائرہ بنانے والا ہیپلی۔

گزشتہ صدی کے اخیر نصف میں جو دُمدار ستارے دیکھے گئے تھے ان میں زیادہ مشہور وہ ہیں جو ۱۸۵۵ء - ۱۸۶۱ء اور ۱۸۸۲ء میں نظر آئے تھے۔ اور اس صدی کا سب سے زیادہ مشہور ستارہ ہیپلی ہے جسے ہم نے بھی ۱۹۰۹ء میں دیکھا تھا اور ہندوستان کے اکثر اصحاب نے دیکھا ہوگا۔

حقیقت کہا جاتا ہے کہ دُمدار ستاروں کا قلب شہاب ثاقب کے نہایت چھوٹے چھوٹے اجسام سے ترکیب پاتا ہے جو آفتاب کے گرد گھومتے رہتے ہیں، جب وہ آفتاب سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں تو ان میں حرارت بہت بڑھ جاتی ہے اور آفتاب کی شعاعیں اپنی قوت و افور سے ان کے گیسو مادہ کو ڈھکیلتی ہیں جو ایک طرف دُم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور نور آفتاب کی دم سے روشن ہو جاتا ہے، چنانچہ سرے کا رفتہ رفتہ چھوٹا ہونا بھی اسی کو ثابت کرتا ہے، بعض کی رائے ہے کہ دُمدار ستارے اس کہر بائیت سے پیدا ہوتے ہیں جو فضا میں منتشر رہنے والے ذرات مادہ میں پیدا ہوتی ہے، بعض کا خیال ہے کہ دُم کا نظر آنارو نگاہ کا دھوکہ ہے، بلکہ وہ دُم حقیقتاً آفتاب ہی کا نور ہے، جو ستارے کے سرے کو سچا کر نکل جاتا ہے اور اسپیکٹر سکوپ کے ذریعہ سے شعاعیں تحلیل کرنے کے بعد یہ تحقیق ہوئی ہے کہ ہیپلی ستارہ کی دُم میں کاربونک ایسڈ مادہ پایا جاتا ہے، لیکن یہ تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مادہ اس کے سرے سے پیدا ہوتا ہے یا آفتاب کے نور سے۔

ان مختلف رایوں میں زیادہ تر رجحان علماء کا اول الذکر بیان کی طرف ہے اور وہ دُمدار ستاروں کو شہاب ثاقب کے اجسام صغیرہ کا مجموعہ ظاہر کرتے ہیں۔

شہاب ثاقب اجسام صغیرہ ہیں قریب قریب انہیں عناصر کے جن سے ہمارا کرہ ارض مرکب ہے، ان اجسام کا ہجوم یا جھنڈ آفتاب کے گرد نہایت وسیع دائروں میں گردش کرتا رہتا ہے، جب دوران گردش میں یہ زمین سے قریب ہو جاتے ہیں تو زمین اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اگر یہ اجزاء لطیف ہیں تو زمین کے گرد جو کمرہ ہوا ہے اس میں پہنچ کر رگڑ کی وجہ سے کبھی دھواں بن کر غائب ہو جاتے ہیں، کبھی شدت حرارت سے ان میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور آسمان میں ایک منور لکیر کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن اگر یہ زیادہ کثیف ہیں تو کبھی کبھی ان کے اجزاء زمین پر پتھر وغیرہ کی صورت میں گر جاتے ہیں، آپ نے عجائب خانوں میں ان پتھروں کو دیکھا ہوگا۔

غزل

(نیاز فتحپوری)

ز دلم نہ گفتے نہ ز تو شنید نیتے
وے اینقدر بدانم کہ غمت کشید نیتے
نہ مژہ تراوشش آرد نہ دلم چکید نیتے
گر ہے مگر ز تارِ نفسم برید نیتے
ز رہِ کرم سپردی بہ بزمِ چرا نہ گفتی
کہ قرارِ دستِ نرمت ہرے پمید نیتے
دلِ من ز التفاتِ نگہتِ خراب گشتہ،
مگر او ہنوز محو غمِ نارسید نیتے
تو و صد ہزار کیفِ نگہِ شراب ریزے
من زار و ارتعاش لبِ ناچشید نیتے
بمزارم از چہ آئی، بگذر شتاب بگذر
کہ مرا ز شورِش اکنوں سرِ آرمید نیتے
ز حدیثِ حسن و الفتِ خبرے جز این ندارم
نگہتِ خلید نیتے، جب گرمِ تپید نیتے
سخنِ مگوزِ حسنِ نگہش نیازِ اکنوں
کہ دلِ زبوں رسائے غمِ نارسید نیتے

۱۸۵۶ء اور اردو شعراء

(گوپی چند نارنگ)

۱۸۵۶ء میں انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں جو ہنگامہ رونما ہوا، اسے ”پہلی جنگ آزادی“ کے نام سے پکارنے میں تمام مودھل کا اتفاق نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سنہ ستادہ کے واقعات کے پیچھے کوئی منظم یا باقاعدہ تحریک نہ تھی۔ اس کا آغاز سپاہیوں کی شورش سے ہوا، جس کی پشت پناہی زیادہ تر ان راجوں اور نوابوں نے کی، جن کی ریاستیں انگریزوں نے چھین لی تھیں اور جو حالات کے ہاتھوں لڑنے کے لئے مجبور تھے۔ اس لڑائی کے پیچھے چونکہ کوئی قومی تحریک نہ تھی اس لئے یہ ملک گیر نہ ہو سکی۔ چند دیسی فوجی افسر، راجے اور نواب تو اس میں ضرور شریک ہوئے لیکن عوام نے اس کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں اور نیپال نے انگریزوں کی مدد کی۔ یہ شورش زیادہ تر دہلی اور اتر پردیش تک محدود رہی۔ راجپوتانہ، حیدرآباد، ممبئی اور مدراس اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ گواٹیار، اندور، بھرت پور وغیرہ ریاستیں بھی شروع سے آخر تک انگریزوں کے ساتھ رہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ جلد ہی خود دیسی سپاہ کے مختلف گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی مثبت قومی تصور یا آدرش ان گول کے پیش نظر نہیں تھا۔ ان سب کے سینوں میں بس ایک ہی جذبہ تھا۔ وہ انگریزوں کی مخالفت۔ جو سراسر ایک منفی تخیل ہے۔ اس طرح گویا خود ان کی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت مضمر تھی۔

بے شک یہ شورش ناکام رہی لیکن اس کے باوجود ۱۸۵۷ء کے واقعات بہت اہم تاریخی کارنامہ ہیں۔ انھیں آج کے معیاروں سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ اتنا ثابت ہے کہ اس وقت انگریزوں کے خلاف نفرت بہت نمایاں تھی اور اس کا اظہار نہایت شدت سے ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے اور انگریزوں کے خلاف یہ ان کا پہلا متحدہ محاذ تھا۔ یہ شورش کامیاب نہ ہوئی لیکن اس سے انگریزوں کی برتری کا غلط تصور ٹوٹ گیا اور ہندوستانیوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی جس سے آگے چل کر قومیت کا شعور ابھرنے میں مدد ملی۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا کہ ۱۸۵۶ء کے واقعات میں اردو شاعروں کا کتنا حصہ تھا اور ملک کی اس تحریک آزادی میں شامل ہو کر انھوں نے کیا کیا قربانیاں دیں، اہمیت سے غافل نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ اس زمانہ کے اردو شاعر وطنیت کے کیا جذبات رکھتے تھے اور ان کا برطا اظہار ان کے لئے کیوں ممکن نہیں تھا۔

انیسویں صدی کے وسط کے اردو شاعروں کے ہاں حسد وطن کے جدید تصور کی تلاش عبث ہے۔ اس زمانہ میں وطنیت کا تصور آج کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ یہ جدید تصور انیسویں صدی کے اواخر میں نئی تاریخی تبدیلیوں کے نتیجے میں مغرب سے آیا۔ اس کے برعکس وطنیت کا قدیم تصور اپنے زمانہ کی مخصوص تاریخی اور سماجی قوتوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس کی بنیاد سیاسی یا معاشی نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں جذباتیت اور انفرادیت زیادہ تھی اور اجتماعیت کم۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تصور ایثار، قربانی، علو ہمتی، جرات اور مردانگی کے عالی جذبات سے ملوث تھا۔ ہندوستان کا دھڑانی تصور اس زمانہ میں فاصلوں کی دوری، باہمی نفاق اور طوائف الملوکی کے باعث ذہن میں آہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انگریز اس ملک پر اپنا قبضہ و اقتدار بڑھاتے گئے اور ان کے مفاد ہمارے مفاد سے ٹکراتے گئے۔ غلامی اور مظلومیت کا احساس ہندوستان کے تمام طبقوں میں قدمہ مشرک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس زمانہ کی اردو شاعری میں بھی اس کے اثرات خال خال نظر آتے ہیں۔ کہیں کوئی مصحفی، کوئی جرات، کوئی مومن، ان مخفی دلی جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ لیکن چونکہ

اس زمانہ میں آزادی کا تصور ابھی مذہبی یا اخلاقی روپ دھارے ہوئے تھا اس لئے عام طور پر انگریزوں کی مخالفت اس بنا پر ہوئی کہ ان کی محکومیت میں دین اور مذہب خطرے میں ہے۔ اضطراب کی ان چنگاریوں کو جب شجاعت اور دلیری کے قدیم اوصاف کی ہوا ملی تو یہ ۱۸۵۷ء میں جنگ کی آگ کی طرح چاروں طرف اس سرعت سے پھیل گئیں جس کا انگریزوں کو خواب و خیال تک نہیں تھا۔ مگر وطنیت کی تحریک جذباتی اور انفرادی سرچشموں سے پھوٹی تھی اس لئے اس کا تخریبی پہلو زیادہ نمایاں رہا۔ انگریزی عملداری کا خاتمہ کرنے اور سرکاری اداروں کی تباہی و بربادی کی حد تک اس نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ لیکن جہاں تک انقلاب کے تعمیری حصہ کا تعلق ہے، اجتماعی جذبات کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ پہلو بالکل نامکمل رہ گیا اور جن علاقوں پر دیسی سپاہ قابض ہو گئی تھی ان کی شیرازہ بندی بھی ٹھیک طور پر نہ ہو سکی جس وجہ سے انگریز وہاں پھر متصرف ہو گئے۔

اس زمانہ کی اردو شاعری بھی تاریخی قوتوں کے اس تصادم اور جذبات کی اس کشمکش کی آئینہ دار ہے۔ اس ضمن میں اردو شاعروں نے حب وطن کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ان کا صحیح تجزیہ کرنے کے لئے ان تاریخی قوتوں پر نظر رکھنا ضروری ہے جو اس وقت کارفرما تھیں۔

لارڈ کلائیو سے لارڈ ڈلہوزی تک کمپنی کے جوڑ توڑ سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کسی نہ کسی بہانے سارے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ جس کام کی ابتدا جنگ پلاسی سے ہوئی تھی اس کی انتہا بکسر کی لڑائی پر ہوئی۔ اس کے بعد نہ صرف نواب وزیر انگریزوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا بلکہ شاہ عالم بھی ان کے زیر اقتدار آ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو گورنر جنرل لارڈ آلن برائن انھیں ملتان قلعہ کی سکونت ترک کر دینے اور شاہی خطابات سے دست بردار ہو جانے کو کہا۔ مرزا خزندہ کے انتقال کے بعد مرزا قمر شاہ کو ولی عہد ہی اس شرط پر بنایا گیا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد ان کے لئے صرف خطاب شہزادہ باقی رہے گا۔ پنشن سوا لاکھ کے بجائے ۱۵ ہزار ہوگی اور قلعہ خالی کر دیا جائے گا۔ گویا آل تیمور کا خاتمہ ہر لحاظ سے ایک فیصلہ شدہ بات تھی۔

ادھر کمپنی دیسی ریاستوں پر بھی یکے بعد دیگرے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ دارن ہیٹنگنز، بنگال، بنارس اور روہیلکھنڈ کو خاک میں ملا چکا تھا۔ ولزی نے میسور، پونا، ستارا اور کئی دوسری ریاستوں کو تختہ مشق بنایا۔ انگریزوں کی ان دست درازیوں کے خلاف راجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے دلوں میں شدید نفرت پھیل رہی تھی ڈلہوزی کی بدعنوانیوں نے اسے شدید تر کر دیا۔ سلطنت کی حدود بڑھانے کے لئے کمپنی دیسی حکمرانوں کو معمولی معمولی بہانوں پر ہر طرف کرنے لگی اور ان کی پیشانیں ضبط کر لی گئیں۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز پنجاب پر بھی قابض ہو گئے۔

معاشی استحصال کی حالت یہ تھی کہ کمپنی نے دیسی صنعت کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ تجارت کساد بازاری کا شکار تھی اور کسانوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔

سماجی سطح پر بھی ہندوستانیوں کا خطرہ کچھ ایسا ہی حال تھا۔ انگریز سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں اصلاحی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد ان کے کام کو ان کے عزیزوں اور رفیقوں نے جاری رکھا۔ مولوی احمد شاہ درازی اور مولانا لیاقت علی نے اس سلسلہ میں مزید خدمات انجام دیں اور شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں اہم حصہ لیا۔

ادھر نانا راؤ پیشوا اور عظیم الشان دیسی ریاستوں میں خفیہ سازش کا جال بچھانے لگے۔ بنگال میں علی نقی خاں فقیروں اور سنیہ سہیل کے ذریعہ فوجیوں کو بھڑکا رہا تھا۔ چھانیوں میں رات کو خفیہ جلسے ہوتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے آغاز ہی میں آتش زدگی کی اکا دکا وار داتیں شروع ہو گئی تھیں، حتیٰ کہ چربی لگے ہوئے کار تو سوں کا بہانہ پا کر فوجیوں کی نفرت کا لاوا ۱۰ مئی کو میرٹھ چھاؤنی سے پھوٹ پڑا اور چند دنوں میں بغاوت کی یہ آگ سارے شمال وسطی ہندوستان میں پھیل گئی۔ لیکن چونکہ بغاوت پوری طرح منظم نہ تھی انگریزوں کو تباہی کا موقع

مل گیا ایران سے صلح ہو جانے کی وجہ سے ہرات سے انگریزی فوجیں فوراً کوٹ آئیں جہاں کو جانے والے انگریزی دستے بھی کھلتے میں روک لئے گئے یہاں ہی پنجاب کے سکھوں نے انگریزوں کو جو کمک پہونچائی اس نے تو باغیوں کی کمرہی توڑ کے رکھ دی۔ انگریزوں نے سکھوں اور مغلوں کی دیرینہ عداوت کا پورا فائدہ اٹھایا اور حکمت عملی سے کام لے کر سکھوں کو باغیوں سے الگ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر کو دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

الہ آباد میں بغاوت کے بانی مولانا مہا بخت علی، لکھنؤ میں مولوی احمد شاہ، کانپور میں ناننا صاحب اور جھانسی میں لکشمی بائی تھیں۔ لکھنؤ میں نابالغ شہزادے برہمپور کو مسند نشین کیا گیا اور ملک اودھ حضرت محل نگر میں مقرر ہوئیں۔ دسمبر ۱۸۵۷ء سے فروری ۱۸۵۸ء تک انگریزی فوجیں تانتیا توپی بمبیل اور رانی لکشمی بائی کے ساتھ معرکوں میں مصروف رہیں۔ مارچ میں لکھنؤ پر تیسرا حملہ ہوا اور باغیوں کی پھوٹ کی وجہ سے انگریز لکھنؤ پر دوبارہ قابض ہو گئے۔

اس کے بعد باغی سردار بریلی میں جمع ہوئے یہاں بھی شدید جنگ ہوئی اور باغی ہار گئے۔ جون ۱۸۵۷ء میں مولوی احمد شاہ مدراسی اور رانی لکشمی بائی دونوں مارے گئے گونا گونا صاحب اور ان کے ساتھی اس کے بعد بھی انگریزی فوجوں پر چھاپے مارتے رہے لیکن دراصل بریلی کی شکست کے بعد باغیوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کے بچے کچھے کیڈر نیمپال کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر پر دہلی میں مقدمہ چلا اور وہ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیے گئے۔

اردو کے اکثر شاعر ۱۸۵۷ء کی اس آویزش و پیکار کی زد میں بری طرح آئے۔ ان میں سے بعض نے عملی طور بھی اس جنگ میں حصہ لیکر اپنی وطن دوستی کا حق ادا کیا۔ اردو کے یہ شاعر اگرچہ کسی ملکی یا قومی جذبے سے تو آشنائے تھے لیکن اپنی سلطنت کے جاتے رہنے سے ناخوش ضرور تھے اور انگریزی حکومت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ کمپنی نے جس وقت ہندوستان میں اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنا شروع

۱۲۵۷ء میں ہنگامہ کے موقع پر جو اشتہار بنام شاہ اودھ اور دیگر مقامات قرب و جوار میں شہر کے لئے تھے ان میں سے دو پٹت کنہیا لال نے نقل کئے ہیں (ص ۳۰۰ محار بے عظیم) یہ دونوں اشتہار اردو میں ہیں۔ ایک نثر میں اور ایک نظم میں ہے، جانے ایسے کتنے منظوم اشتہار اس زمانہ کے شاعروں نے اپنے دل جذبات سے مجبور ہو کر لکھے ہوں گے۔ الہ آباد کے اس منظوم اردو اشتہار کے چند شعر یہاں بطور تیرک پیش کئے جاتے ہیں:-

داسطہ دین کے لڑنا نہ پئے طبع بلاد	اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد	ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد
فرض ہے تم پر مسلمانوں جہاد کفار	اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال	اُس پر ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ و بال
جو کہ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں	بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
حق تعالیٰ کو مجاہد رہہ بہت سبھاتے ہیں	مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبی جہاد	چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
کہ ملک گھر میں پڑے جو تیاں چٹخاؤ گے	اپنی سستی کا جزا فسوس نہ پھیل پاؤ گے
بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے	حیف اس دولت بیداد سے مومن سبھائے
تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب	شکریہ تو نے دیا اے مرے رب لا رباب
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار	سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو	دقت آیا ہے کہ ملو اور کوڑھ بڑھ مارو

کیا اردو شاعری ابھی تصوف کی گود میں پناہ لے رہی تھی اور ہر قسم کے جذبات ایک مبہم سے روحانی انداز میں ادا کئے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس زمانہ میں بھی انگریزوں کے خلاف صاف صاف اظہار خیال کی بعض مثالیں مل جاتی ہیں۔

جنگِ پلاسی کے موقع پر نواب سراج الدولہ کی شہادت ایک قومی حادثہ تھی۔ درو مندوں کے دل پر اس سے جو گزری راہِ رام نراین موزوں کا یہ شعر:-

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری
اس کی صبح اور موثر تر جانی کرتا ہے۔

بکسر کی لڑائی کے بعد نواب وزیر انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا۔ کمپنی نے جنگ کا منہ مانگا تاوان لیا، اودھ کا بھی کچھ علاقہ چھین لیا۔ اس کے علاوہ انگریزی فوجیں بھی اودھ میں تعینات کر دیں۔ جن کے خرچ کا بوجھ نواب وزیر کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ نواب بے چارہ بے بس تھا اور انگریز جو چاہتے منواتے اور جو چاہتے کرتے تھے۔ اغلب ہے، جرأت نے یہ شعرا انھیں حالات سے متاثر ہو کر کچھ بولے

کہئے نہ انھیں امیراب اور نہ وزیر انگریزوں کے ہاتھ میں نفس میں امیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں بنگالے کی مینا میں یہ پورپ کے امیر
ایسے ہی ہندوستان کے معاشی استحصال پر مصحفی کا یہ شعر:-

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ تھی کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی
محض اتفاق نہیں بلکہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کے کہا گیا ہے۔

انگریزوں کے خلاف ملک میں جو مذہبی اور نیم مذہبی تحریکیں بلند ہوئیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اصلاحی تحریک الٰہی میں رہے اہم تھی۔ یہ مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی خوفناک لہر کو بھی روک دینا چاہتی تھی۔ اردو شاعروں میں مومن اس تحریک سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ مومن، شاہ اسماعیل شہید کے ہم سبق اور مولوی سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کے خیالات کا اثر مومن پر اتنا گہرا تھا کہ ”وہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے“۔

ثمنوی جہاد یہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

اپنی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں مری جان فدا ہو تری راہ میں
ان کے ایک فارسی قصیدے کے یہ اشعار بھی نظر انداز کرنے کی چیز نہیں:-

ایں عیسویان بلب رسانند جان من و جان آفرینیش
تا چند بجزاب ناز باشی فارغ ز فغان آفرینیش
برخیز کہ شور کفر برخاست اسے فتنہ نشان آفرینیش

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:-

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاس ایمان ہے معرکہ جہاد چل دیکھے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جاں ہے کرتے تھے بتوں پر قربان
یہ اشعار بھی اسی نفرت کی اڑتی ہوئی چنگاریاں ہیں:-

مومن حسد سے کرتے ہیں سماں جہاد کا ترسا صنم کو دیکھ کے نصرا نیوں میں ہم
کہتے ہیں یہ ہم چاٹ کے خاک اس میں ہوں گونا گونا پر اب تو زمین بوس کلیسا نہ کریں گے

غرض یہ کہ "غدر" سے پہلے اردو شاعری میں بھی انگریز دشمنی کے خیالات کا اثر پڑھنے لگا تھا، غدر کا سب سے زیادہ زور دہلی میں رہا اور دہلی ہی اس وقت اردو شعروادب کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ یوں تو نادر شاہ اور مرہٹوں کے حملوں کے بعد دہلی میں شعرو شاعری کی محفلیں سرد ہو گئی تھیں لیکن سیاسی اور معاشی ابتری کے باوجود محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں اردو نے کچھ ایسا سنبھالا لیا کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک دہلی میں بیسیوں باکمال شاعر جمع ہو گئے۔ ان میں شیخ امام بخش صہبائی، شیخ ابراہیم ذوق، مفتی صدر الدین آذرہ، میرزا اسد اللہ غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفہ، حکیم آغا جان عیش وغیرہ جیسے کہنہ مشوق شاعر بھی تھے اور آزاد، حالی، داغ، قادر بخش صابر، شہاب الدین، ماقبہ، سالک، مجروح، میرزا انور، باقر علی کمال وغیرہ جیسے نو عمر بھی۔ بقول صاحب گل رعنا "جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔" واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مایل تھے۔ بادشاہ اور شہزادے، امراء اور بازاری، صوفیہ اور رند مشرب، سب کو اس کا ذوق تھا۔ تذکرہ گلستان سخن "غدر" سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہے (طبع ۱۲۷۱ھ - ۱۸۵۴ء) اس میں دہلی کے ۳۵ شاعروں کا ذکر ملتا ہے جن میں زیادہ تر ہم عصر ہیں۔ شاہ نصیر، مومن اور ذوق وغیرہ تو خیر ۱۸۵۴ء سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ باقی میں سے اکثر نے انقلاب کے دنوں میں دہلی کی صبح و شام اپنی آنکھوں دیکھی۔ قلعہ کی تباہی اور شہر بیتاہ کی بربادی ان کی اپنی بربادی کی داستان ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ان واقعات کے آسودہ ساحل تماشائی نہیں رہے بلکہ اس دریائے خون کے کنارے بن گئے تھے۔ انھوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور انگریزوں کے خلاف نظمیں لکھیں۔ کئی شاعروں نے قربانیاں دیں۔ مصیبتیں سہیں اور قید و بند کی کڑیاں جھیلیں۔ کئی بے گناہ گوئی سے آزاد کئے گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد انقلابیوں کو "نک حرام" اور "مفسدان کو چشم" کہتے اور انگریزوں کی مدح کرتے رہے لیکن دہلی کی تباہی اور بربادی پر پروہ دل ہی دل میں کڑھتے بھی تھے۔ غرض یہ کہ ۱۸۵۶ء کے واقعات کی طرف اردو شاعروں کا رد عمل مختلف اور متنوع طریقوں سے ہوا اس کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان میں سے چند اہم شاعروں کا ذکر فرداً فرداً کیا جاتا ہے۔

(باقی)

نگار کے پچھلے فائل

۳۲	=	جولائی تا دسمبر	=	(سالنامہ ہندی شاعری نمبر)	=	۱۵۱
۳۶	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر)	=	۱۵۱
۳۷	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر)	=	۱۵۱
۳۹	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ نظیر نمبر)	=	۱۵۱
۴۰	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ انتقاد نمبر)	=	۱۵۱
۴۴	=	جولائی تا دسمبر	=	(سالنامہ ماجد ولین نمبر)	=	۱۵۱
۴۶	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ افسانہ نمبر)	=	۱۵۱
۴۷	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر)	=	۱۵۱
۴۹	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر)	=	۱۵۱
۵۰	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ داغ نمبر)	=	۱۵۱
۵۲	=	جنوری تا دسمبر	=		=	۱۵۱
۵۳	=	جنوری تا دسمبر	=		=	۱۵۱

نوٹ :- مرن ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہنچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول اک کے علاوہ ہے۔

فیض نگار لکھنؤ

محمود غزنوی کے خلاف بعض الزامات کی تردید

جہاں تک ہندو قوم کے جذبات کا تعلق ہے، تمام مسلم فرمانرواؤں میں وہ محمود غزنوی سے بہت زیادہ متنفر ہیں اور یہ تنفر اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ موجودہ نصاب کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی نہیں ہیں اور اس کو سب سے بڑے ”ہندو دشمن“ انسان کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

محمود کے خلاف یہ زہر دراصل بعض فرنگی مورخین نے پھیلایا تھا، جنہوں نے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے اور ان میں نا اطمینانی پیدا کرنے کے لئے، محمود کو بدنام کیا اور بعد کو بعض ہندو مورخین نے بھی ان کے اتباع میں بغیر تحقیق کے وہی سب کچھ لکھنا شروع کیا جو مغربی مورخین نے ظاہر کیا تھا۔

محمود کے خلاف جو الزامات قائم کئے گئے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن ان کا خلاصہ یہ ہے کہ: ”محمود بڑا متعصب تھا، ہندوؤں کا سخت دشمن تھا، تلوار کے زور سے اسلام پھیلانا چاہتا تھا اور محض بت شکنی اس کی زندگی کا حقیقی مقصود تھا اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا لالچی، قزاق، بخیل، شراب خوار تھا اور (بہ سلسلہ ذکر آواز) اسے غیر فطری جنسی حرکات کا بھی عادی ظاہر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور انصاف سے کام لے کر نتائج تک پہنچا جائے تو ان میں سے کسی ایک الزام کی بھی تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برخلاف وہ بڑا علم دوست، محیر، غیر متعصب اور بلند اخلاق کا انسان نظر آتا ہے۔ جولائی ۱۹۵۶ء کے اسلامک ریویو میں جناب نور احمد صاحب کا ایک مقالہ اس موضوع پر شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے محمود کا صحیح کردار پیش کر کے ان تمام الزامات کی تردید کی ہے جو اس پر قائم کئے جاتے ہیں۔

ہندوؤں کی مذہبی آزادی سب سے پہلا الزام اس پر یہ عاید کیا جاتا ہے کہ وہ بزورِ شمشیر اسلام پھیلانا چاہتا تھا، اور ہندوؤں کو ان کے غیر مسلم ہونے کی بنا پر بے دریغ قتل کر دیتا تھا۔ فاضل مقالہ نگار نے اس کی تردید کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ محمود اصولی اسلام کا سخت پابند تھا اور اس نے کبھی اسلام کی ”لا اکراہ فی الدین“ کی بلند تعلیم سے انحراف نہیں کیا۔ اس نے کبھی کسی ہندو کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا اور نہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے کسی کو ہلاک کیا۔ چنانچہ انگریزی مورخ ”الفنسٹن“ نے محمود کی بے تعصبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”واقعات سے کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ میدانِ جنگ سے ہٹ کر اس نے کبھی کسی ہندو کو قتل کیا ہو۔“ اسی کے ساتھ سر ہیگ مصنف ”کیرج ہسٹری آف انڈیا“ کا بیان ملاحظہ ہو، جنہوں نے صاف صاف اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ”اس کے عہد میں ہندوؤں کو پوری آزادی حاصل تھی اور ایک بڑی فوج ہندو سپاہیوں کی اس نے بھرتی کی تھی جن میں سے کسی ایک کو بھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔“

فوج میں اور فوج سے باہر اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز کر رکھا تھا۔ جن میں تلک رائے، ہزاری رائے اور سوئی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

محمود ایک فاتح انسان تھا اور اس سلسلہ میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق اس کے سامنے نہ تھی۔ خود ہندوستان پر اس نے جتنے حملے کئے ان میں دو حملے مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی تھے، اس نے اگر ہندوستان کے ہندو راجاؤں پر حملے کئے تو

اسی کے ساتھ ماوراء النہر اور ایران کے مسلم فرمانرواؤں کے خلاف بھی فوج کشی کی۔

اس نے اسلام پھیلانے یا ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے کبھی ہندوستان پر حملہ نہیں کیا، اور نہ اس نے کبھی وہ مذہبی جہاد کیا جس کا ذکر اوایل تاریخ اسلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے دربار کے شاعروں اور نقیبوں نے ازراہ تعلق و جاہلوسی اسے مجاہد، بت شکن وغیرہ کے الفاظ سے بھی یاد کرنا شروع کیا اور اس طرح لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ اس نے محض اشاعت اسلام کی غرض سے ہندوستان پر حملے کئے تھے۔ حالانکہ اس کا اصل مقصود صرف ملک گیری و فاتحانہ تسلط تھا اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اس نے صرف انھیں مندروں کو توڑا جو قلعہ اور سیاسی مرکز کی حیثیت رکھتے تھے اور جہاں خزانہ پایا جاتا تھا۔ ان چند مندروں کے علاوہ کسی اور مندر کو نہیں توڑا اور جب لڑائی ختم ہو گئی تو اس نے ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی دیدی۔ چنانچہ خود ایک ہندو مورخ ڈاکٹر ایشور ٹوپانے اپنی کتاب "Coltana in pre-mogul times" میں ظاہر کیا ہے کہ: "محمود نے صرف انھیں مندروں کو توڑا جو سیاسی مرکز تھے اور جن میں بڑے بڑے خزانے محفوظ تھے اور صلح ہو جانے کے بعد اس نے کسی مندر کو ہاتھ نہیں لگایا، ظاہر ہے کہ اگر اس کی بت شکنی مذہبی تعصب سے متعلق ہوتی تو وہ فتح حاصل کرنے کے بعد وہ اسے اور زیادہ آسانی و آزادی سے کر سکتا تھا اور بہر ہندوؤں کو مسلمان بنا سکتا تھا، حالانکہ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

کہا خیر ہندوستان کو چھوڑے، خود غزنائے جو اس کا پایہ تخت تھا ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ابوالعلاء المصیری نے اپنے رسالۃ الغفران میں لکھا ہے کہ محمود کے زمانہ میں غزنائے کے اندر محلے کے محلے ہندو آبادی کے تھے اور انھیں اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ محمود کی تمنا یہ تھی کہ وسط ایشیا میں ایک وسیع سلطنت قائم کر کے اس پر فرمانروائی کرے اور مذہب سے اسے کوئی تعلق نہ تھا چنانچہ محمد ابن علی، مصنف مجمع الاحیاء لکھتا ہے کہ حملہ ہندوستان کا اصل باعث جے پال (راجہ وہیند) تھا جس کو سبکتگین دو بار شکست دے چکا تھا، لیکن جب وہ پھر جنگ کے لئے باہر نکلا تو محمود نے غزنائے فتح کر کے اس کی قوت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد محمود کے حملے ہندوستان پر صرف سیاسی و ملکی اغراض سے تعلق رکھتے تھے اور مذہب سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔

محمود کی علم دوستی محمود پر جو الزام قائم کئے جاتے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ پست ذہن کا ناشائستہ، بد ذوق انسان تھا، حالانکہ اس جیسے علم و ہنر کے قدردان اور ذہنی ترقی کے شائق فرمانروا بہت کم ہوئے ہیں۔

وہ خود بھی بڑا ذی علم انسان تھا اور بڑا اچھا ذوق شعری رکھتا تھا۔ عربی نے بھی 'لباب الالباب' میں اس کا کلام نقل کیا ہے۔ صاحب ابن خلکان کا بیان ہے کہ علماء، فضلاء، شعراء اور ادباء کی صحبت کا اسے بڑا شوق تھا اور ایشیا کے ہر حصہ کے

تمام ماہرین علوم و فنون اس کے دربار میں جمع تھے۔ جب وہ کسی شہر یا ملک کو فتح کرتا تھا تو وہ سب سے پہلے وہاں کے فنی لوگوں کو جمع کر کے غزنا بھیجتا تھا۔ تاریخ گزیرہ کا مصنف لکھتا ہے کہ محمود ہر سال چار لاکھ دینار (اشرافی) اپنے دربار کے علماء و فضلاء پر صرف کرتا تھا، الفسطن اپنی "تاریخ ہند" میں ظاہر کرتا ہے کہ "محمود کے زمانہ میں غزنا اتنا بڑا زبردست مرکز اہل علم و کمال کا تھا کہ اس سے

قبل اس کی مثال ایشیاء کے کسی فرمانروا کے عہد میں نہیں ملتی۔ ابوریحان (مصنف تحقیق مل ہند)، ابونصر عینی، فارابی (مشہور فلسفی) ابن سینا (مفکر و طبیب)، مورخ ثعلبی، فردوسی، عنصری، دقیقی، اور منوچہری وغیرہ اسی کے دربار کے رتن تھے۔ اس نے متعدد

مکاتب، مدرسے، کتب خانے اور عجائب گھر قائم کئے جو زبردست تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ اس نے غزنا میں ایک ایسی مسجد تعمیر کی جو اپنے زمانہ کے عجائب میں شمار ہوتی تھی۔ اس میں سونے چاندی کے فانوس اس نے آویزاں کئے، نہایت قیمتی فرش

بچھا کیا اور اسی سے ملحق ایک بہت بڑی یونیورسٹی قائم کی۔ یہ یونیورسٹی اتنی بڑی تھی کہ وہ وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کے قیام

کے لئے تین ہزار مکانات اس کو بنوانا پڑے۔ اساتذہ کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر تھے۔

محمود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک کنیز کا لڑکا تھا اور اپنے باپ کی ناجائز اولاد۔ اور اس الزام کی بنیاد فردوسی نے ہی الزام کے اس شعر پر قائم ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے موعودہ انعام نہ ملنے پر محمود کی بھج میں کہا تھا، وہ شعر یہ ہے :-

پرستار زادہ نیاید بکار اگرچہ بود زادہ شہریار

محمود پر یہ الزام بالکل غلط ہے کیونکہ اسکی ماں امیر زلفستان کی بیٹی تھی اور سبکتگین (محمود کا باپ) اس کا شوہر تھا۔ علاوہ اس کے یہ شعر فردوسی کا نہیں ہے اور نہ فردوسی نے کوئی نظم محمود کی بھج میں کہی۔

تاریخ کی کتابوں میں یہ روایت بہت عام ہے کہ اس نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کی خدمت سپرد کی اور وعدہ کیا کہ وہ ہر شعر کا معاوضہ ایک دینار دے گا، لیکن جب شاہنامہ مکمل ہو گیا تو محمود نے بجائے اثر فی دینے کے فی شعر نفرتی سکے دینا چاہا۔ فردوسی دل شکستہ ہو کر چلا گیا اور اس نے محمود کی بھج میں ایک نظم کہہ کر شاہنامہ میں شامل کر دی (جس کا ایک شعر اوپر نقل کیا گیا ہے) کہا جاتا ہے کہ فردوسی کے انتقال کے بعد محمود نے موعودہ رقم اس کی لڑکی کو بھیجی اور اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

یہ روایت بالکل غلط ہے اور عہد محمود کے کسی مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ محمود کے ہم عصر مورخ عینی نے بھی جو بڑا صاف گو اور بیباک مورخ اور محمود کا مخالف تھا، اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا، اگر اس میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو وہ یقیناً اس کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتا۔

یہ روایت سب سے پہلے نظامی عروضی (مصنف چہار مقالہ) نے نقل کی ہے، لیکن اس روایت کا ذریعہ اس نے کہیں ظاہر نہیں کیا۔ نظامی نے محمود کے ڈیڑھ سو سال کے بعد چہار مقالہ لکھا، اور ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں محمود کے دشمنوں نے یہ روایت گھڑ کر شاہنامہ میں وہ بھجیہ نظم بھی شامل کر دی ہو۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ خود چہار مقالہ کی بابت بھی بہت کچھ اشتباہ ظاہر کیا جاتا ہے اور اس کے جو مختلف نسخے پائے گئے ہیں ان میں باہم بہت اختلاف و تضاد ہے، اس کے بعد جو تاریخی کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ اختلاف اور زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فردوسی کا نام، اسکی ولایت، سکونت، ولادت، وفات، شاہنامہ کا آغاز و اختتام، محمود تک اس کی رسائی، شاہنامہ لکھنے کی فرمائش، تکمیل کے بعد محمود کا موعودہ انعام دینے سے انکار وغیرہ، ان تمام واقعات میں باہم گرتضاد پایا جاتا ہے۔

فردوسی کہتا ہے کہ اس نے شاہنامہ ۳۵۰ میں ختم کیا اور اس کی تکمیل میں اس کو ۳۰ - ۳۵ سال لگ گئے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ اس نے شاہنامہ کی تصنیف کا کام ۳۶۸ یا ۳۷۰ میں شروع کیا ہوگا۔ یعنی محمود کی تخت نشینی سے ۲۳ سال قبل اور اس لئے یہ کہنا کہ فردوسی نے محمود کی فرمائش پر شاہنامہ لکھنا شروع کیا، صحیح نہیں ہو سکتا۔

محمود اور سومانہ کہتا جاتا ہے کہ جب محمود نے سومانہ فتح کر کے اس کے بت لنگم کو توڑنا چاہا تو وہاں کے پجاریوں نے کہا کہ اس بت کو نہ توڑے وہ اس کے ہموزن سونا چاندی دینے کو طیار ہیں۔ لیکن محمود نے کہا کہ میں بت پرست نہیں، بت شکن ہوں اور آخر کار اس بت کو توڑ ڈالا اور اس کے اندر بیٹے جواہرات بھرے تھے لے لئے۔ لیکن یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے، اور بعد کو گھڑی گئی ہے۔ کیونکہ اس عہد کے کسی مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا، مورخین نے فتح سومانہ کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں لیکن بت توڑ کر اس کے اندر سے جواہرات لے لینے کا ذکر کسی نے نہیں کیا، یہاں تک کہ فرخی اور دوسرے شعراء نے بھی اس کا اظہار نہیں کیا اور نہ خود محمود نے اپنے خط میں جو خلیفہ بغداد کو لکھا تھا اس کا ذکر کیا ہے

ہو سکتا ہے کہ محمود نے بہت توڑا ہو لیکن اس کے اندر جواہرات کا پایا جانا صحیح نہیں کیونکہ البرونی نے لنگم بہت پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور اس نے لکھا ہے کہ یہ بہت ٹھوس پتھر کا ہوتا تھا اور اس کے اندر کوئی خول ایسا نہ ہوتا تھا جس کے اندر جواہرات چھپائے جاسکیں۔

محمود اور ایاز کہا جاتا ہے کہ محمود کو اپنے ایک غلام ایاز سے بڑی محبت تھی اور اس کو اس کی امر پرستی پر محمول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ معتبر تاریخی کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور یہ روایت بھی محمود کے دشمنوں کی وضع کی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ محمود نے مرتے وقت سارا خزانہ اپنے سامنے ڈھیر کرایا اور اس کو دیکھ کر محمود اور طمع زر رونے لگا۔ اس روایت کی تکذیب خود محمود کے کردار سے ہوتی ہے، جس نے علم و فضل کی قدر دانی میں ہمیشہ بیدینغ دولت صرف کی، وہ اتنا تنگ نظر نہیں ہو سکتا کہ نزع کے وقت وہ دولت کی جدائی پر آنسو بجائے۔ علاوہ اس کے وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہوگا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس دولت کے چھپنے کے خیال سے آبدیدہ ہو جاتا جو اس کے بعد اس کے بیٹے ہی کو ملنے والی تھی۔

گلدھائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات - تقطیع بڑی۔

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :- کتابستان - الہ آباد

”گلدھائے پریشاں“ فارسی اور اردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے۔ آغاز عشق سے انجام عشق تک چلنے والے مراحل پیش آتے ہیں ان کے متعلق سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور چہچہہ چیدہ متوالی مضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذہ سابق کی تمیں تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

اردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلنریب اضافہ ہے اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

”شہیدہ کے بود مانند دیدہ“

نگار کے بعض سالناموں کی

قیمت میں اضافہ

(جو چند دن بعد آپ کسی قیمت میں بھی نہیں مل سکتے)

مومن نمبر	ریاض نمبر	پاکستان یا جوہلی نمبر
تین روپیہ	تین روپیہ	پانچ روپیہ
مشرق وسطی نمبر	حسرت نمبر	داغ نمبر
پانچ روپیہ	تین روپیہ	چھ روپیہ
فرمانروایان اسلام نمبر	علوم اسلامی نمبر	خدا نمبر
چار روپیہ	چار روپیہ	پانچ روپیہ
اصناف سخن نمبر		محمولہ اک ذمہ خریدار
پانچ روپیہ		

منیجر نگار لکھنؤ

مشاعر نگار

مصرع طح

”وہ لطف پہ مایل ہونہ سکے میں جور کا خوگر ہونہ سکا“

اس زمین میں چند مخصوص قافیوں پر طبع آزمائی کی دعوت دی گئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ توقع سے بہت کم غزلیں موصول ہوئیں اور جو ہوئیں بھی ان میں بہت کم اشعار قابل انتخاب نکلے۔ بہر حال جو چند اشعار گوارا ہونے کی حد تک انتخاب میں آسکتے تھے وہ درج کئے جاتے ہیں۔
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص طرح پر شعر کہنے کی زحمت اب کم گوارا کی جاتی ہے، اس لئے آہندہ اس سلسلہ کو بند کیا جاتا ہے۔
(نیاز)

سیدہ اختر :-

جو زخم دیا اُس قاتل نے گلزار وفا کا پھول بنا !
اربابِ محبت زندہ ہوئے اُس برقی ادا کے تیروں سے !
اے واضح ناداں تو لیکن، آئینِ محبت کیا جانے ؟
وہ پریش غم کو جب آئے ہم بھول گئے شکوے سے !
سب اُس کو ستگر کہتے رہے لیکن وہ ستگر ہونہ سکا !
اور جس پہ چلائی تیغِ کرم وہ عشق میں جانبر ہونہ سکا !
جو کشتہ تیغ ناز ہوا، وہ کشتہ خنجر ہونہ سکا !
افسانہ حراماں ہم سے بیاں داند کہ اکثر ہونہ سکا !

اکرم دھولیوی :-

غم عشق کی پہلی منزل تھی دل اس سے بھی سربر ہونہ سکا
قائم بے نشاط دیدار بتکا رہے غمِ امید اب تک
طے راہِ محبت کیا ہوتی اک چوٹ سے جانبر ہونہ سکا
حالانکہ محبت میں اُن سے ملنا بھی مکرر ہونہ سکا

بے آس کوئی جیتا کب تک حسرت کا لہو پیتا کب تک
اے موحنا مجھ پر ترا اچھا ہوا جانبر ہو نہ سکا
شارق میرٹھی ایم۔ اے :-

بربادی الفت کی اپنی، روداد نہیں کچھ اس کے سوا
ہم جس پہ ٹٹا بیٹھے سب کچھ، اپنا وہ سنگم ہو نہ سکا
کچھ اور ہی غم ہے اے ہمد، جس نے مجھے ٹڑپا رکھا ہے
دنیا کے غموں کا تو مجھ کو، احساس بھی اکثر ہو نہ سکا

شریف اور نگ

جو بھول نہیں سکتے تھے تجھے ان لوگوں کی حالت کیا ہوگی
اے تلخی غم تیرا تو مجھے احساس بھی اکثر ہو نہ سکا
آنکھوں میں جو آنسو بن نہ سکا وہ خون جگر بھی پانی ہے
اس قطرہ آبِ نیساں کی کیا قدر جو گوہر ہو نہ سکا

نیاز فتحپوری :-

تھا ضبط بھی لازم الفت میں، پر آپ سے چھٹ کر ہو نہ سکا
یہ کام بہت مشکل نہ سہی، پر ہم سے تو اکثر ہو نہ سکا
تھا دل کا مٹا نامہ نظر، تو لطف سے کام لیتا زرا
یہ وار بھی تجھ کو کرنا تھا، پر تجھ سے سنگم ہو نہ سکا
اک بار جو ان سے کہنا تھا وہ کہہ دیا، اس کے بعد مگر
ہم مٹ ہی گئے اظہارِ محبت ہم سے مکرر ہو نہ سکا
دونوں کا نتیجہ ایک ہے وہ امید ہو یا ہو یا س مگر
وعدہ پہ میں کچھ دن جی تو لیا گو اس سے سر ہو نہ سکا
اک قطرہ آبِ نیساں کا وہ تھا جو صدق تک جا پہنچا
اور دوسرا صرف موج ہوا جو ڈوب کے گوہر ہو نہ سکا
جاندا دگی الفت کی مری روداد نہیں کچھ اس کے سوا
وہ لطف پہ مایل ہو نہ سکے، میں جو رکاوٹ ہو نہ سکا
میں بھی تو سنوں ہاں کچھ تو کہو، کیوں غیر یہ تم نے صرف کیا
وہ عشوہ جو نشتر بن نہ سکا، وہ ناز جو خنجر ہو نہ سکا

اچھا نہ کیا در سے جو اٹھایا تم نے نیاز محروں کو،
کچھ دن تو جیسا بیشک وہ مگر اس صدمہ سے جانبر ہو نہ سکا

”ہے میری منزل یہاں سے آگے“

(فضا ابن فیضی)

(۱) ————— دل و جگر کے جنوں کدے میں شعور کی کائنات لے کر
جو نازش صبح زندگی ہے وہ مسکراتی سی رات لے کر
مری شبوں کو دکھا رہی ہیں یہ ظلمتیں روشنی کا رستہ غموں کے دشوار موڑ پا کر سنور گیا ہے خوشی کا رستہ
مجھے کدھر لے کے جا رہا ہے کشاں کشاں زندگی کا رستہ
قیام کی آرزو نہیں ہے غلط غم جستجو نہیں ہے

دُعائیں دو ذوق جستجو کو
کہ میرے اس چاک بے رفو کو
اب احتیاج رفو نہیں ہے قیام کی آرزو نہیں ہے
قدم تو میرے زمین پر ہیں نظر مہ دکھ کشاں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۲) ————— پکارتی ہیں مرے جنوں کو حیات کی پاکباز راہیں
نہیں ہیں خود اپنے پیچھے خم سے یہاں ابھی بے نیاز راہیں
بجائے خود ہر قدم ہے منزل جنوں مرا سفر ہے شاید ہر ایک ذرہ ہے مہر آسائے امتحانِ نظر ہے شاید
افق کے مینائے زرخشاں میں ہمیں زورِ سحر ہے شاید
جنوں کو بھر ہوش آ رہا ہے وہ آنکھ ملتا ہوا اٹھا ہے

غنودگی کافسوں ہے باطل
فسانہ خواں ہے سکوتِ ساحل
قدم قدم منزل آشنا ہے جنوں کو پھر ہوش آ رہا ہے
کہو تو ہمراہ لے کے چل دوں جنوں کو اس کا رواں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۳)

اندھیری راتوں کی خاکستری ستارے اگا رہا ہوں
 نظر کی افسردہ کیاریوں میں جواں نظارے اگا رہا ہوں
 ابھی تو سینے پہ موج کے میں حسین کنارے اگا رہا ہوں
 سکھارہا ہوں میں تشنگی کو حریف صہبائے جام ہونا
 ہے میرے مشرب میں کفر برحق شرابِ دوراں کا خام ہونا
 شرابِ دوراں کی تلخیوں کو ابھی ہے کچھ اور عام ہونا
 غنودہ کیوں میں ترے اراٹے تراشِ مرستیوں کے جاوے
 خموش کیوں ہے فتنے کا سرگم
 یہ کیوں ہے نے مستیوں کی مہم
 صراحی و جام کو صدا دے غنودہ کیوں میں ترے اراٹے
 خروشِ بیداری جنوں ہے سکوتِ خوابِ گراں سے آگے
 ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۴)

دھلے ہوئے آہِ نار سا میں نفس کے بے ربط سلسلے میں
 عجیب انداز میں جنوں کے زقربتیں ہیں نہ فاصلے ہیں
 غمِ زمانہ کی یہ خراشیں تو میری منزل نہ بن سکیں گی
 یہ آرزوؤں کی سرد لاشیں تو میری منزل نہ بن سکیں گی
 یہ زخمِ دل کی گلابی قاشیں تو میری منزل نہ بن سکیں گی
 ہٹو ذرا مجھ کو راستہ دو مجھے خدا کے لئے نہ روکو
 نہ توڑ دے ذوقِ رہروی دم
 قدمِ قدم ہے محوِ اپنا ماتم
 ہواے منزل کے تیز جھونکو! ہٹو ذرا مجھ کو راستہ دو
 کہ مجھ کو جانا ہے اور ابھی کچھ حدودِ سود و زیاں سے آگے
 ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۵)

رکے ہوئے زندگی کی پلکوں پہ خوں شدہ آرزو کے آنسو
 ڈھلے ہوئے نفرتوں کے خم میں خلوص کی آبرو کے آنسو
 یہ جام میں آبِ جانفراہ کہ رندِ آشفتمند کے آنسو
 ہے دل کے زخموں کی ایک مالا یہ اشک کی سلک گوہر بھی
 نہ پوچھو آنکھوں میں چہرہ ہے ہیں حیات کے خوابِ مرہر بھی
 کہ میرے بازو پہ بار ہے اب نزاکتِ زلفِ عنبریں بھی
 یہ زاوئے ہیں نظر کے دھوکے چلا ہوں میں بے نیاز ہو کے
 یہ شام کی بوئے دنوازی
 یہ حسن کی فطرتِ ایازی
 یہ زانوئے ہیں نظر کے دھوکے
 مجال کیا ہے کہ مجھ کو روکے
 نظر کے دھوکوں سے دور یعنی طلسمِ عیشِ رواں سے آگے
 ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۶) یہ حسن دوشیزگی کے جلوے نظر میں لیتے ہوئے لبیرے
 یہ زلف کی کافرانہ شاخیں یہ رخ کے کشمیر گول سویرے
 یہی اُجالے ہی اندھیرے نہ روک لیں میرا راستہ پھر
 یہ زندگی کے حسنین تقاضے نہ روک لیں میرا راستہ پھر
 بچا کے دامن گزر رہا ہوں جنوں کی تہذیب کر رہا ہوں
 نگاہ والے اب آئیں دیکھیں
 کہ موج طوفانی زندگی میں
 برنگ ساحل ابھر رہا ہوں بچا کے دامن گزر رہا ہوں
 کوئی مجھے پھر بلارہا ہے دیارِ حسن بتاں سے آگے
 ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۷) یہ جوئے کہسار کے کنارے شراب و مہتاب کے جزیرے
 سکوت کے بحرِ بکیراں میں سرود و مضراب کے جزیرے
 ہوائے فردوس آگئی ہے سوا دگیسوئے مشکبوتک پہنچ گیا سو زقشنہ کامی تراوش بادۂ سبوتک
 میں کب پہنچتا ہوں دیکھنا ہے درگلستانِ آرزوتک
 ابھی تورستے میں کارواں ہے یقین ابھی توقف گماں ہے
 حجابِ جادہ اٹھے تو دیکھوں یہ گردِ منزل ہے تو دیکھوں
 نمودِ منزل ابھی کہاں ہے ابھی تورستے میں کارواں ہے
 نکل پڑا ہوں طلب کی رو میں مگر صدفِ کارواں سے آگے
 ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۸) چمن کی نکھری ہوئی روش پر بہاریں پہلو بدل رہی ہیں
 سیاہیاں بھی کرن میں تل کر سحر کے سانچے میں ڈھل رہی ہیں
 نفسِ نفسِ عمرِ رائیگاں کا اسیرِ لمحاتِ دلنشیں ہے جو رنگ سے کانٹے کی بس رہا ہے وہ زہر بھی رشکِ انگبیں ہے
 ہزار کچھ ہو حیاتِ نو کی یہ چھاؤں پھر بھی گھسی نہیں ہے
 کلی پہ ہیں دھوپ کی نگاہیں یہ ابرِ دھول کی سلگتی راہیں
 صبا ہے صحرے کے مرحلے میں ہیں بنتِ گلزار کے گلے میں
 ابھی حایلِ خزاں کی باہیں کلی پہ ہیں دھوپ کی نگاہیں
 کوئی مجھے راستہ دکھا دے رہ بہار و خزاں سے آگے
 ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۹) نفس کم آگاہی و جنوں کے نسیم عرفاں میں ڈھل کے ہے
وہ رات کی بزم میں ستارے لباس رنگیں بدل کے
بجا کہ اکثر اُداس راتیں سحر کی میزبان میں تلی ہیں
بجا کہ اکثر فسرہ نظریں شرابِ انوار سے دھلی ہیں
ابھی کمالِ نظر کی راہیں نظروں پر کہاں کھلی ہیں
پہنچ و خم راستہ کے ہر سو! شکستہ ہے رہبری کا جادو

چراغ ہیں روشنی سے عاری
یہ صبحِ دانش کی تیرہ کاری
بکھر گئے ہیں جنوں کے گیسو
پہنچ و خم راستہ کے ہر سو!
ہوا ہول میں پھر بھی کام فرسا حدِ یقین و گماں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

(۱۰) ابھی ہیں پیوستِ روح انساں غمِ زمانہ کے تیر شاید
فغاں و شیون کے زہر سے بے نوا کدوں کا خمیر شاید
لہو گلوں کا ٹپک رہا ہے ہنوز کانٹوں کی آستیں سے
ہوا میں بڑھ بڑھ کے پونچھتی ہیں پسینہ خود شمع کی جہیں سے
نہ جانے اٹھیں گے کتنے فتنے ابھی خداؤں کی سرزمین سے
مگر مجھے اس سے واسطہ کیا کہ راستہ ہی الگ ہے میرا

یہ مانا ہستی گریزِ پاس ہے
حیاتِ خوابوں کا سلسلہ ہے
ہر اک نشہ ہے خمارِ آسا
مگر مجھے اس سے واسطہ کیا
مجھے دبانا ہے ایک جنتِ خرابہ دو جہاں سے آگے
ہے میری منزل یہاں سے آگے

شفقت کاظمی

کچھ اپنا جذبہ دل بھی اثر دکھانہ سکا
کہاں کہاں تری حسرت لے پھری مجھ کو
ترے سلوک سے مجھ کو شکایتیں بہت
مرے خیال کی دنیا پہ جو محیط رہے
دن اپنی عمر کے یوں بھی گزر گئے ایسے دوست
نیا نہ عشق نے ہر چند سعی کی شفقت
بائیں جستجوئے پیہم کبھی داہ خواہ تیرے
نہ ٹلی تری نظر سے غمِ دل کی داد شاید
ترے تغافل بے جا میں فرق آنہ سکا
مگر کبھی ترے کوچے کی راہ پا دسکا
یہ اور بات ہے دل سے زباں پہ لائے سکا
مرانصیب کہ میں اُن کو یاد آنہ سکا
ترے بلا سے اگر میں قرار پا نہ سکا
مزاجِ یار مگر کچھ سمجھ میں آنہ سکا
تری بزم تک نہ پہنچے تری بزم تک آئے
ترے در سے آ رہا ہے کوئی آج مگر جھکائے

دختر نیل

(ریاض الرحمن شمس کا مثنوی)

ہاں اسی طرح سے تاریخ کا بنتا ہے مزاج
کیوں نہ ہو اور فزول وقت کے ملتے کھی شکن
اب تو ہر کوچہ و برزن میں ہیں راویں موجود
اس قدر کھائے ہیں انسان نے سیاست فریب

جانے کب عظمت آدم کا خیال آئے گا

جانے کب سامنے آیاں کا سوال آئے گا

ہے ابھی تک تو زمانے کو حقایق سے گریز
جہدِ بیہم سے نکل جاتے ہیں تقدیر کے بل
یوسف مصر ہے یہ، چشم ابوالہول ہے یہ
آخری تیر بھی ترکش کا چلا کر دیکھیں

ظلم و عدوان کے شیشوں میں چمک ہے معدوم

جس طرح کاغذی پھولوں میں مہک ہے معدوم

مصر، عنوان ہے تہذیب کے کا شانے کا
مصر نے کتنے شہنشاہوں کی اکٹی ہے بساط
مصر کا روشن و تابندہ ستارہ ناصر
جس میں شیروں کی صفت جذبہ ہے پروانے کا

شمس پاتے ہیں یونہی منزل مقصود کی راہ

نہیں باقی کبھی خواہوں کے دھندلگوں میں پناہ

نکبت بریاوی :-

کون سمجھا ہے یہ آدابِ محبت کے یوز
تجھ سے بڑھ کر نہ سہی، تیرے طلبگار مگر
نظرۂ دل نہ سمجھا تھا پہ بجا رکھتے تھے
مدعا اور بھی کچھ تیرے سوار رکھتے تھے

ایس - ایچ - ریکانی :-

حاصلِ زلیست سمجھتے ہیں اُسی کو لے دوست
کوئی کیا جانے کہ اس میکہد ہستی میں
ناخداے چلا کشتی کو جو ساحل کی طرف
لاکھ دھوکا سہی ہستی کی ہے ایسی ہستی

جستجو میں تری جو وقت گزارا ہم نے
جرعہ تلخ کئے کتنے گوارا ہم نے
دفعۂ کر دیا طوفاں کو اشارا ہم نے
مرتے مرتے نہ کیا جس سے کنارا ہم نے

عمر انصاری :-

فصل گل جانے کدھر کھو گئی دکھلا کے درس
گھر کے کیا جانے کب آئی تھی گھٹا ساون کی
قافلہ ہے کوئی ٹھہرا ہوا زنداں کے قریب
چاہتا لاکھ ہوں اس بزم میں جاؤں نہ مگر
اللہ اندر سے عبادت کدہ دل کہ جہاں
بقیے بھی غم ہوں مجھے بخش دے لے جانِ عمر

پھر وہی خوابِ گلستاں ہے وہی کنجِ قفس
آج تک دیدہ گریاں کا وہ عالم چمکے بس
شب کے سنبلے میں سنتا ہوں اک آواز جہیں
کیا کروں دل کو کہ دل پر نہیں چلتا کوئی بس
کہیں مسجد کا ہے مینار نہ مندر کا کلس،
تیرے ہر غم کی ضمانت مرا ایک ایک نفس

کنول نسیم کنجاہی :-

آج پھر آئی ان کی یاد
کس سے کہیں ویرانی دل
ہو گیا سارے دل خاموش
آن ہے شکایت کس کو ہے
موجِ نسیم گل کی طرح
سنتے ہیں یہ آج کنول بھی

آرزوئے دل زندہ باد
شہر کبھی کھتا یہ آباد
یوں بھی کیا ہے آن کو یاد
دیدہ دل سے ہے فریاد
آ جاتی ہے آن کی یاد
اٹھ گئی دنیا سے ناشاد

انیس امام - آرہ :-

آج کی شام مجھے پھر تری یاد آئی ہے
مہکی مہکی سی فضا میں ہیں گھٹا چھائی ہے
سرخ خوں سے کبھی گہرا ہے تری یاد کا رنگ
دل کی دادی میں مہکے ہیں زخموں کے گلاب

پھر وہی غم ہے وہی عالم تنہائی ہے
پھر تری زلف کہیں بام پہ لہرائی ہے
جانے کس راہ سے ہو کر تری یاد آئی ہے
یاد آئی ہے تری یہ کہ بہار آئی ہے

مطبوعات موصول

داستان تاریخ اردو پروفیسر حامد حسن قادری کی مشہور تصنیف ہے جس کا پہلا ایڈیشن اب سے ۱۲ سال قبل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن اشاعت کے بعد ہی غالباً چند سال کے اندر ختم ہو گیا تھا لیکن کسی ایسی ضخیم کتاب کا شائع کرنا جو صرف طبقہ خواص یا طلبہ کے ذوق و ضرورت کی چیز ہو، آسان بات نہ تھی اور اسی لئے اترت تک اس کا دوسرا ایڈیشن شائع نہ ہو سکا۔ اس دوران میں پروفیسر حامد حسن قادری بھی پاکستان چلے گئے، اس لئے اس کی دوسری اشاعت ملتوی ہوتی رہی۔

پاکستان پہنچ کر پروفیسر صاحب کو معلوم ہوا کہ وہاں اس کی مانگ بہت زیادہ ہے تو انھوں نے اس کے پبلشر کو پھر متوجہ کیا اور اس طرح اب اس کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آگیا۔

اردو ادب کی تاریخ پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں زیادہ تر شعر و سخن کو سامنے رکھا گیا ہے۔ تاریخ نثر اردو پر اس سے کم کتابیں لکھی گئیں اور جو لکھی گئیں وہ بھی ہر لحاظ سے مکمل نہ تھیں۔ البتہ شمس اللہ قادری کی ”اردو سے قدیم“ تو بیشک ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اسی کے ساتھ حیدر آباد کے بعض فاضل مصنفین کی کوششیں بھی سراہے جانے کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ باقی دوسری کتابوں میں پروفیسر حامد حسن قادری ہی کی ”داستان تاریخ اردو“ پر نگاہ پڑتی ہے جو محض داستان نہیں ہے اور باد صفت نامکمل ہونے کے ایک حد تک مکمل بھی جاسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری اور اردو نثر نگاری دونوں اپنی جگہ یکساں اہمیت رکھتی ہیں، اور ان دونوں پر اچھی تصانیف کی ضرورت تھی اور ہے، لیکن افسوس ہے کہ شاعری کو لوگوں نے زیادہ قابلِ توجہ سمجھا اور اس پر متعدد کتابیں لکھی گئیں اور شاید اس لئے کہ فراہمی مواد کے لحاظ سے ان پر لکھنا آسان تھا، لیکن نثر نگاری سے کم اعتنا کیا گیا، کیونکہ یہ معاملہ واقعی ”کوہ کنڈن“ کا تھا۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو متعدد ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب زمانہ قبل آغاز اردو سے تعلق رکھتا ہے اور یہ مختصر ہی نہیں بلکہ مقصر بھی ہے۔ اسے صرف چار صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ اس پر زیادہ مفصل گفتگو کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہی انھوں نے اردو زبان اور ریختہ کا ذکر چھپڑ دیا اور صرف ۲۵ صفحات میں محمد غوری کے زمانہ سے لیکر ۱۹۴۷ء تک (تقریباً چھ سو سال) کے تمام دکنی، گجراتی اور شمالی ہند کے نثر نگاروں کی فہرست دے کر اس گفتگو کو ختم کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد وہ نثر نگاری کے چھ دور قائم کر کے آگے بڑھے ہیں۔ پہلے دور میں انھوں نے دکن کے نثر نگاروں کو لیا ہے جس میں سلطنت بہمنی سے لے کر عہد مغلیہ کے بعد تک کے نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سب سے پہلا نام ”شیخ گنج العلم“ (۱۵۹۳ء) کا ہے اور اردو تصانیف میں سب سے پہلی کتاب ”معراج العاشقین“ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس دور کے آخری مصنف ان کے نزدیک قاضی بدرالدولہ تھے (ان کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی تھا)۔

دوسرے دور میں شمالی ہند کے مصنفین کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دور کے پہلے مصنف ان کے نزدیک فضل علی فضلی تھے جن کی سہ ماہی پہلی تصنیف وہ مجلس (کمر بل کتھا) ۱۸۳۱ء میں لکھی گئی تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے سودا، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور میر علی حسین نجفین (مصنف نو طرز مرصع) کا کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یوروپین مصنفین اردو کا ذکر کیا ہے جن میں ڈاکٹر گنارائن

گارسن داسی، فیلنس اور گراہم بیلی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔
تیسرے دور میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین (میرامن دہلوی، حیدری، افسوس، میرزا علی لطیف وغیرہ) کی خدمات کا ذکر کیا ہے
اور بیرون کالج کے مصنفین میں کلیم دہلوی، حکیم شریف خاں، افشار قتیل، مولوی اسماعیل، سرور اور مہجور کا۔
چوتھے دور کے قابل ذکر مصنفین میں انھوں نے سب سے پہلے سدا سکھ لال کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد جن کا حال تحریر کیا ہے ان میں
گویا، آرزو، صہبائی، غالب، غلام امام شہید اور غلام غوث بھٹی خاص اہمیت رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے بعض مصنفین
کو بھی لے لیا ہے۔

پانچویں دور کے مصنفین میں سر سید احمد خاں، امیر مینائی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چیرغ علی پرزادہ روشنی
ڈالی گئی ہے اور چھٹے دور میں مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکا اللہ، مولوی نذیر احمد، سید علی بلگرامی، مولانا شبلی، مولانا حالی،
میر ناصر علی، سید ناصر زبیر فراق کا ذکر کیا ہے اور اخیر کے چند صفحات میں موجودہ دور پر اچھٹی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔
اس کتاب میں موجودہ دور کو چھوڑ کر، گزشتہ تمام ادوار کے مصنفین کا ذکر جس نہج و اسلوب سے کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ یقیناً بہت جامع
و رافع ہے گو اس کی انتقادی حیثیت معرض بحث ہو سکتی ہے۔ اس تصنیف کی وہ خصوصیت جس کو میں نے بہت پسند کیا زمانہ و تاریخ کی
تعیین کا اہتمام ہے جس کی طرف ہمارے اکثر تذکرہ نگار کم توجہ کرتے ہیں۔

کلام کا نمونہ نقل کرنے میں انھوں نے کہیں بکل سے کام لیا ہے اور کہیں اسراف سے، وہ اس کا کوئی معتدل اصول قائم نہیں کر سکے
اہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ جس حد تک قدیم مصنفین کا تعلق ہے انھوں نے بڑی قیمتی معلومات فراہم کر دی ہیں۔
ملز تحریر بہت صاف و شگفتہ ہے اور کتاب کی ترتیب میں مورخانہ اسلوب کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ کاغذ، طباعت و کتابت وغیرہ
افیس ہے اور ۸۰۰ صفحات کی یہ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔ قیمت تیرہ روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: - لکشمی ٹرائین انڈیا - آگرہ۔

آزاد کتاب گھر دہلی نے اسے شائع کیا ہے اور بعض ایسی خصوصیات کے ساتھ جو اس سے قبل کے ادیشنوں میں
نہیں پائی جاتیں۔ سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کو مالک رام صاحب نے مرتب کیا ہے جو "غالب غالبیا"

دیوان غالب

میں سندر کی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے غالب پر بہت کام کیا ہے اور ان کی ترتیب سے ایک ادیشن دیوان غالب کا نکالنا ضروری تھا۔
موصوف نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے
کہ دیوانی غالب کے کتنے ادیشن اور نسخے کب کب شائع ہوئے اور ان کی خصوصیات کیا تھیں، ان کا یہ مقدمہ ایک نوع کی مہل گرائی ہے
میں کے دیکھنے کے بعد ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس ادیشن کی صحت و ترتیب ہر لحاظ سے بہت مکمل ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالب کا وہ نیا کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے جو اس سے قبل کے نسخوں میں نہیں پایا جاتا اور
اسی کے ساتھ بھوپال کے نسخہ حمید یہ کا انتخاب بھی دیا گیا ہے (گو یہ انتخاب خود انتخاب کا محتاج ہے)

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ غالب کے عکس تحریر کے ساتھ ان کی وہ تصویر بھی اس میں شامل ہے جو سب سے زیادہ مقبر خیال
کی جاتی ہے اور وہ مختصر سا فارسی دیباچہ بھی شامل کر دیا گیا ہے جو غالب نے اپنے "دیوان ریختہ" کے ادیشن کے لئے لکھا تھا۔
چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ طباعت، کتابت، کاغذ اور جلد پوش وغیرہ ہر چیز نہایت نفیس و پاکیزہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ
کتابت کے اغلاط سے یہ ادیشن بھی پاک نہ رہ سکا اور مرتب و پبلشر کو ایک غلط نامہ کا اضافہ بھی کرنا پڑا۔

سایز کتابی، ضخامت ۶۰ صفحات، قیمت ساڑھے پانچ روپیہ جو کسی طرح زائد نہیں کسی جاسکتی۔ ملنے کا پتہ: - آزاد کتاب گھر دہلی
جناب شورش کشمیری کی تالیف ہے جس میں مرحوم ظفر علی خاں کے حالات و ذوق شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کوئی
باقاعدہ مربوط و مسلسل کتاب سوانح نہیں ہے بلکہ بیان ہے جناب شورش کے ان تاثرات کا جو مرحوم کی صحبت میں ان کے

ظفر علی

دل پر قلم ہوئے۔ فاضل مصنف کو کال ربح صدی تک مرحوم کا قرب رہا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ کون اس کتاب کے لکھنے کا مستحق ہو سکتا تھا۔

اس کتاب میں مرحوم کی خانگی، مذہبی، سیاسی و ادبی زندگی جن جن پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاضل مصنف محض عقیدتمند پرستار نہ تھے بلکہ ناقد جلیس بھی تھے اور باوجود تفاوتِ عمر کے مرحوم کے تمام اقداماتِ حیات پر مفکرانہ نظر ڈالتے تھے۔

مرحوم بطبعاً صحافی ادیب تھے اور ساری عمر انھوں نے اسی مشغلہ میں بسر کر دی۔ حیدرآباد میں جب تک رہے ادبی ذوق کے ساتھ ان کے سیاسی رجحانات بھی نمایاں ہوتے رہے اور جب انھوں نے لاہور پہنچ کر زمیندار نکالا تو پھر وہ کھلم کھلا سیاست میں آگئے اور اپنے پر جوش مقالوں اور نظموں سے سارے ملک سے اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کا خراج وصول کیا، وہ جس حد تک سیاسی انسان تھے، اسی حد تک مذہبی بھی تھے اور انھیں دونوں باتوں نے ان کی نظموں میں سرفروشانہ رنگ پیدا کر دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں جب مولانا وحید الدین سلیم اور میں دونوں ادارہ زمیندار سے متعلق تھے مجھے بھی مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زمیندار انتہائی عروج پر تھا اور مجھے معلوم ہے کہ وہ زمیندار کو اس کے معیار پر قائم رکھنے کے لئے کتنی جدوجہد سے کام لیتے تھے۔

جناب شورش نے اپنی کتاب میں زیادہ تر مرحوم کے اسی مجاہدانہ حرکت و عمل پر گفتگو کی ہے اور ایسے دلچسپ انداز میں کہ ساری کتاب ایک نہایت دلچسپ داستان ہو کر رہ گئی ہے۔

جناب شورش بڑے پر جوش ادیب ہیں اور اسی جوش و ولولہ نے ان کے ادب میں بڑی بلند بانگ خطابت کا انداز پیدا کر دیا ہے جو ان کی نظم و نثر دونوں میں کارفرما نظر آتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ظفر علی خاں ایسے پر جوش صحافی کے حالات قلمبند کرنے کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا تھا۔ کتاب کے اخیر میں مرحوم کی نظموں کا انتخاب بھی شامل کر دیا گیا ہے جو بہت ضروری تھا۔ کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور چار روپیہ میں دفتر چٹان لاہور سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب بھی جناب شورش کا شمیری کی فکر و قار کا نتیجہ ہے اور اس میں بھی تمام وہی باتیں پائی جاتی ہیں جو ان کی دوسری تصانیف کی خصوصیات ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ پنجاب کی ان چند لرزہ خیز اور ہنگامہ پرور ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی سحر زبانی سے عوام و خواص دونوں کی ذہنیت پر زبردست اثر ڈالا اور رجحانات کا رخ بدل دیا۔

سید صاحب ان مذہبی علماء میں سے ہیں، جنھوں نے سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور ملک میں عام بیداری کرنے کے لئے زبردست قربانیاں کیں۔ جناب شورش نے ان کے حالات بھی بڑے خلاص و صداقت کے ساتھ نہایت پُر اثر انداز میں قلمبند کئے ہیں جو یقیناً بڑا دلچسپ مطالعہ ہیں اور ہندوستان کی تاریخ سیاست لکھنے والوں کے لئے بڑا مفید مواد۔

یہ کتاب بھی نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور دفتر چٹان لاہور سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اردو نے کیا حصہ لیا۔ یہ تالیف مقدمہ کے علاوہ چار ابواب میں منقسم ہے، مقدمہ میں ایک مختصر سی روداد ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ آزادی میں اردو

نے کتنا حصہ لیا اور اس کے بعد چاروں ابواب میں ان تحریروں اور نظموں کا اقتباس ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی تھیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حامیانِ اردو کی طرف سے ۱۸۵۷ء کی یادگار منانے کا طریقہ اس سے بہتر کچھ اور نہ ہو سکتا تھا جس سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ہندو مسلمان دونوں کی مشترک ادبی و علمی زبان اردو ہی تھی اور دوسری طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو سے زیادہ شاید کسی اور زبان

میں اس کی اہمیت ہی نہ تھی کہ وہ اس قدر وسعت و تنوع کے ساتھ احساس آزادی پیدا کر سکتی۔

ملک کو ادبی پبلشرز مہمبئی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے نہایت کاوش سے یہ تمام مواد ایک جگہ اکٹھا کر کے اتنی بڑی علمی خدمت انجام دی ہے کہ یہاں کا ادب و سیاست کبھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کتاب نہایت خوبصورت ٹائپ میں نفیس کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور اس خیال سے کہ اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے، اسکی قیمت صرف چار روپیہ رکھی گئی ہے۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات - طے کا پتہ :- ادبی پبلشرز - ممبئی (۸)

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی مشہور ادبی و انتقادی تصنیف کا پانچواں ایڈیشن ہے جسے کتابستان الہ آباد نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔

ادبی رجحانات

موضوع کے لحاظ سے کوئی ایسی کتاب لکھنا آسان نہ تھا جو اردو نظم و نثر دونوں کی تاریخ کو سامنے رکھ کر تمام رجحانات کو اپنے اندر سمیٹ سکے لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ مشکل خدمت جس خوبی و جامعیت کے ساتھ انجام دی ہے، وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ انھوں نے مختلف رجحانات اور ادبی اقدار دونوں کو بیک وقت سامنے رکھ کر جو مورخانہ رواداد اس کتاب میں پیش کی ہے، وہ خالص ادب و خالص نقد دونوں کا بڑا معتدل امتزاج ہے اور ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے جو تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں بعض ان جدید رجحانات (مثلاً پیروڈی اور رپورٹناژ) کو بھی لیا گیا ہے جو اس سے قبل کے ایڈیشنوں میں نہ پائے جاتے تھے۔ کتاب بڑے اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور تین روپیہ بارہ آنے میں کتابستان الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

۱۹۵۷ء میں جناب حفیظ جالندھری کا جشن جوہلی راولپنڈی میں منایا گیا تھا اس سلسلہ میں بعض اہل قلم نے مقالات بھی پڑھے تھے اور ہند و پاک دونوں ملکوں کے بہت سے اکابر علم و ادب نے اپنے پیغامات بھی جوہلی کمیٹی کے نام بھیجے تھے، اب ان تمام پیغامات و مقالات کو یکجا کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ حفیظ کے مختصر سوانح اور ان کے کلام کا کچھ اقتباس بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ حفیظ کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے۔ دنیا اسکی رنگینی سے واقف ہے۔ لیکن یقیناً قابل مہار کباد ہیں وہ زہرہ نفوس جو اپنے ملک کے ادیبوں اور شاعروں کی قدر شناسی میں اس جوش و انہماک سے کام لیں۔

حفیظ کا جشن نچاہہ سا لگی

یہ کتاب سکریٹری گولڈن جوہلی کمیٹی راولپنڈی سے بھر میں مل سکتی ہے۔

یہ کتاب پاک اکاڈمی کراچی نے شایع کی ہے اور منجملہ ان بہت سی کتابوں کے ہے جو ۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی کی یادگار مولانا فیض احمد بدایونی منانے کے لئے حال میں ہندو پاکستان میں شایع ہوئی ہیں۔ ۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی جسے غدر کے نام سے موسوم

مولانا فیض احمد بدایونی

کیا جاتا تھا، ایک بھولا ہوا خواب تھی اور انگریزی حکومت نے اس کی تاریخی حقیقت مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ کو شش کا اٹھانا نہ رکھا تھا، لیکن جب ہندوستان کی آزادی کے بعد انگریزی حکومت کے اثرات ختم ہوئے اور کچھلے حالات و واقعات کے جائزہ لینے کا موقع ملتا تھا تو پتہ چلا کہ جس واقعہ کو غدر سے تعبیر کیا جاتا تھا وہ دراصل جنگ آزادی تھی اور اس جنگ میں حصہ لینے والے ہندو مسلمان سبھی شامل تھے گو سرسید نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ تحریک غدر کا ذمہ دار مسلمانوں کو نہ سمجھا جائے اور وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن آج جلتی پھرتی اس سلسلہ میں شایع ہو رہا ہے اس میں بہت سے نام مسلمانوں کے ایسے نظر آتے ہیں جو اس سے قبل کبھی سننے میں نہ آئے تھے اور انھیں ناموں میں ایک نام مولانا فیض احمد بدایونی کا ہے۔ انھوں نے اگرہ، دہلی اور لکھنؤ وغیرہ میں جو عملی حصہ اس جنگ آزادی میں لیا، اس کی داستان بڑی حیرتناک ہے۔ محمد ایوب قادری صاحب نے انھیں کی سرفروشانہ مساعی کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے اور اسے مستند تاریخی ذرائع سے کہ

ان سے انکار ممکن نہیں۔ کتاب مختصر ہے لیکن بڑی معلومات اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسکی قیمت ۱۲ روپے اور طے کا پتہ :- پاک اکاڈمی اسلام آباد - گولڈن مارا - کراچی۔
دو جلدی اردو نمبر علی بہادر خاں میر دور قید اور پروفیسر گلزار جنھوں نے اس خاص نمبر کو مرتب کیا ہے، قابل مہار کباد ہیں جنھوں نے ایسا مفید، دلچسپ اور پر از معلوم
دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ حامیان اردو میں عملی کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے، جس کا بڑا ثبوت یہ خاص نمبر ہے۔ اس کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے اور دفتر دور قید
دہلی سے مل سکتا ہے۔

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشائیہ میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں چلے اڈیشن کی غلطیوں کو دیکھا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فحہ ری کے تین ہفتوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و تہذیبی حیات کس درجہ ہم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشائے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے قلعہ رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

۵۵ سال کے بعد

ایک بے مثل نفسیاتی مطالعہ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۵۵ سال کے بعد سرور زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، زبان و انداز بیان کے لحاظ سے یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ناول کا لطف دیتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۳۴ روپیہ (علاوہ محصول)

مالہ و ماحلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فنِ شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انہوں نے عدد حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً آجمن جگر، سیاب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ حدیث المثل افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی نشاۃ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اختیار تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا خدو طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکہ الآراء مقالہ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقاداتیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ نہایت مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جو فنِ شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مؤرخانہ نظر اُردو شاعری پر تاریخی تبصروں، اردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی، نقش ہائے رنگ و رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ)، ادبیات اور اصول نقد، نثر، ایڈیٹر حقیقت نگار ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہمت کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، احوال و زوال، موت و حیات و بیماری شہرت و تنیک نامی پریشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سال نامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر)

دومن نمبر جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری ۱۹۲۳ء (ریاض نمبر)

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک متحدہ شاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۲۸ء (پاکستان نمبر)

پاکستان نمبر نگار کا جو بی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رشتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دیر زیں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۲۹ء (انسانہ نمبر)

نگار کا انسانہ نمبر جس میں تقریبات میں انسانے بہترین اہل تشیع کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے براہ سانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ انسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری انسانہ کیا ہونا چاہیے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرق وسطی نمبر)

اس سال نامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ارس ہندی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس میں ایران، مصر، عراق، فلسطین، غیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی ترقیوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے۔ اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں، سالنامہ کو دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۳ء (دآغ نمبر)

(دآغ نمبر) جس میں دآغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے اس نمبر میں قیام رامپور، حمید آباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے فن شعر گویا ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء (فرمانِ دایان اسکاد)

(فرمانِ دایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے، یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر حصے کے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر)

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) جس میں اسلامی علوم و فنون پر تفصیل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر)

خدا کا تصور عہد تاریک سے لے کر عہد حاضر تک۔ بے مثل تاریخی تحقیقی تبصرہ خدا عالم پر۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۷ء (انسان و سخن نمبر)

غزل، قصیدہ، غزلی، رباعی، مرثیہ وغیرہ عہد انسان و سخن پر ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول) منیجر ذکا د لکھنؤ